4

ماں جی



(قدرت اللہ شہاب)
(۱۹۱۷ء۔۱۹۸۶ء)

مصنف کا تعارف

قدرت اللہ شہاب گلگت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گلگت اور جموں و کشمیر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔

قدرت اللہ شہاب نے 1941ء میں انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کا مقابلے کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ وہ ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے پہلے مسلمان تھے جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد شہاب پاکستان آ گئے اور متعدد اہم انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔

قدرت اللہ شہاب نے سیکریٹری جنرل حکومتِ آزاد کشمیر، ڈپٹی کمشنر ضلع جھنگ، ڈائریکٹر انڈسٹریز حکومتِ پنجاب، سیکریٹری اطلاعات حکومتِ پاکستان اور سیکریٹری وزارتِ تعلیم جیسے اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ وہ گورنر جنرل ملک غلام محمد، سکندر مرزا اور صدر ایوب خان کے پرائیویٹ سیکریٹری رہے۔ انھوں نے ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر اور اقوامِ متحدہ کے ادارے یونیسکو میں بھی ذمہ داریاں ادا کیں۔ انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا، جو ملک کے ادیبوں کے لیے ایک مؤثر ادبی پلیٹ فارم ثابت ہوا۔

قدرت اللہ شہاب کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' 1938ء میں شائع ہوا۔ ان کی نمایاں تخلیقات میں ''یا خدا''، ''نفسانے''، ''ماں جی''، ''سرخ فیتہ'' اور ''شہاب نامہ'' شامل ہیں۔ ''شہاب نامہ'' ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جس کی اشاعت سے انھیں ادبی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

قدرت اللہ شہاب کی نثر سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ وہ واقعات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو ان کا ہم سفر محسوس کرتا ہے۔ ان کا اسلوب سنجیدہ مگر دل نشیں ہے، جس میں فکری پختگی اور روحانی جھکاؤ دونوں جلوہ گر ہیں۔

تدریسی مقاصد:

- ☆ افسانے کی صنف اور اس کی بنیادی خصوصیات کو سمجھنا
- ☆ افسانے کے اہم کرداروں اور ان کی خصوصیات کا تجزیہ کرنا
- ☆ افسانے میں بیان کردہ معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی شناخت کرنا
- ☆ افسانوی اسلوبِ بیان اور واقعاتی ترتیب کو سمجھنا
- ☆ طلبہ میں والدین بالخصوص ماں کے احترام اور خدمت کا جذبہ پیدا کرنا

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر 21 لائل پور: (فیصل آباد کا پرانا نام، 1896 میں جھنگ کی ایک تحصیل تھا۔ 1979 میں سعودی فرماں روا شاہ فیصل کے نام سے موسوم کر دیا گیا)، قصبہ: (چھوٹا شہر)، غریب الحال: (نہایت خستہ حال، بہت غریب)، کالونی: (بستی، نواحی بستی)، جوق در جوق: (کثیر تعداد میں، جھنڈ کا جھنڈ، گروہ کے گروہ)، عرفِ عام: (عام طور پر مشہور، عام بول چال)، بار: (گھنا جنگل، دو دریاؤں کا درمیان کا علاقہ جیسے: (مراد ساندل بار کا علاقہ))، آبائی وطن: (باپ دادا کا وطن، بزرگوں کا دیس)، اَراضی: (قطعۂ زمین، دیہی جائیداد، زمین، کھیت)، کھدائی: (کھودنے کا عمل، کھودنے کی اجرت)، ضم: (دو چیزوں کا ملنا، شامل ہونا، ملا ہوا ہونا)، حاکم: (حکومت کرنے والا، حکمران)، معاوضہ: (کسی جائیداد کے عوض دی جانے والی رقم، بدلہ، عوض، اُجرت، زرِ زمین، زرِ ثمن)،

قدم اُٹھانا: (اقدام کرنا، کسی کام کو عملی شکل دینا)، انجام کار: (بالآخر، نتیجے میں، آخر کار، آخر میں)، صبر و شکر: (ہر چیز میں صبر کرنا اور خدا کا شکر ادا کرنا، کسی تکلیف کو برداشت کرنا اور اللہ کا شکر ادا کرنا)، کنبہ: (قبیلہ، خاندان، گھرانا، اہل و عیال، آل اولاد)، توفیق: (کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی تائید، ہمت، حوصلہ)

نمبر 22 پا پیادہ: (بنا کسی سواری کے، بغیر سواری کے پیدل چلنا، پیدل چلنے والا)، محنت مزدوری: (معاش کے لیے محنت کرنا، مزدور کا کام، کام کاج)، پیٹ پالنا: (مشکل سے گزارہ کرنا، روزی کمانا)، ٹال: (لکڑی کی منڈی، وہ مقام جہاں ایندھن کے لیے لکڑی فروخت ہوتی ہے)، قلی: (بار برداری کا کام کرنے والا، سامان اُٹھانے والا، مزدور، حمال)، سوت کاتنا: (چرخے پر اُون، ریشم یا روئی سے دھاگا بنانا)، لیپ دینا: (پلستر کرنا، ضماد کرنا، لیپائی کرنا، دیوار یا فرش پر مٹی اور گوبر کی لپائی کرنا)، بھٹکنا: (ادھر ادھر گھومنا، راہ بھولنا، سرگردان ہونا، جستجو ہونا، جستجو میں ادھر اُدھر گھومنا، جگہ جگہ پھرنا)، مسافت: (فاصلہ، دُوری، عرصہ)، مشقت: (محنت، ریاضت، دُکھ، تکلیف، دِقّت)، جسم نڈھال ہونا: (جسم میں طاقت نہ ہونا، جسم تھکا ہوا ہونا، تھکاوٹ سے جسم بے حس و حرکت ہونا)، پاؤں سوجنا: (پاؤں پر ورم آنا، پیر پر سُوجن چڑھنا)، جھونپڑا: (گھاس پھوس کا مکان، سر چھپانے کا معمولی ٹھکانا، رہنے کی معمولی جگہ، غریب خانہ)، مشتمل ہونا: (شامل یا شریک ہونا، محیط ہونا، ارکان یا اجزا کا شامل ہونا)، عید کا تہوار: (خوشی کا یادگاری دِن، بقرِ عید وغیرہ)، آنہ: (پرانے روپے کا سولہواں حصہ، چار پیسے کے برابر سکہ)، عیدی: (عید کا انعام، عید والے دن ملنے یا دی جانے والی رقم)، مصرف: (خرچ کرنے کی جگہ، کسی چیز کے استعمال یا خرچ کرنے کا موقع)، لگ بھگ: (قریب قریب، تقریباً، ملتا جلتا، مماثل)، امتیاز کرنا: (فرق کرنا، تمیز کرنا، پہچان کرنا، پہچاننا)، رخصت ہونا: (روانہ ہونا، ختم ہونا، وداع ہونا، جُدا ہونا)، غریب مزاج: (سادگی پسند، طبعاً قناعت پسند، غریبوں جیسی طبیعت)، مرغوب ترین: (بہت پسندیدہ، زیادہ من بھاتا، جس کی زیادہ رغبت کی گئی ہو، جو دِل کو زیادہ پسند ہو)، کبھی کبھار: (کبھی کبھی، بعض اوقات، گاہے گاہے، شاذ و نادر)، فرمائش: (طلب، مانگ، خواہش، کسی چیز کا تقاضا کرنا)، اکثر و بیشتر: (بارہا، بسا اوقات، ہمیشہ)، شاذ و نادر: (بہت کم، کبھی کبھار، کبھی کبھی، منفرد، کمیاب)، چپاتی: (توے پر پکائی ہوئی پتلی روٹی)، محبوب خوراک: (پسندیدہ کھانا، مرغوب غذا، پسندیدہ طعام)، رغبت سے: (دل چسپی سے، شوق سے)، براہِ راست: (سیدھا، بلا واسطہ، بغیر کسی ذریعے کے)، حاجت روائی: (ضرورت پوری کرنے کا عمل، حاجت پوری کرنا)، طفیل: (واسطہ، سبب، وسیلے، ذریعے)، دعویٰ: (مدعا، درخواست، وہ بات جو چاہی جائے)، توں توں: (جوں جوں کا جواب، ویسے ویسے، اسی وقت)، آبائی وطن: (باپ دادا کا وطن، بزرگوں کا دیس)، ستانا: (اذیت پہنچانا، تنگ کرنا، دُکھ دینا، پریشان کرنا، دق کرنا)، تھکان: (تھکاوٹ، تھکن)، گرد و غبار: (دھول، مٹی، خاک، مٹی کے باریک باریک ذرے)، برعکس: (مخالف، برخلاف، خلافِ دستور، خلافِ عمل، خلافِ قول و قرار، خلافِ معمول)، بے قرار: (بے چین، پریشان، تنگ، افسردہ)، عزیز و اقارب: (رشتے دار، اپنے خاندان کے لوگ)، تحائف: (تحفے، سوغاتیں، ہدیے، نذرانے، محبت و اکرام کے جذبے سے دی جانے والی چیزیں)، بر ڈھونڈنا: (بیاہ کے لیے جوڑ تلاش کرنا، شادی کے لیے لڑکے یا لڑکی کا جوڑ تلاش کرنا)، مربعہ دار: (پچیس ایکڑ کا مالک زمین دار، مربعہ زمین کا مالک، اراضی کا مالک)، دھوم: (شہرت، چرچا)، خوش قسمت: (اچھی قسمت والا، خوش نصیب، اچھے نصیب والا)، پے در پے: (لگاتار، متواتر، مسلسل، ایک کے بعد ایک، پے بہ پے، یکے بعد دیگرے)، پیام: (زبانی درخواست، بلاوا، پیش کش)، ٹھاٹھ باٹھ: (شان و شوکت، آن بان)، برادری: (کنبہ، ذات کے افراد)، رعب گانٹھنا: (دباؤ میں لانا، سکہ بٹھانا، رعب جمانا، ڈر بٹھانا)، نت نئے: (ہر روز نئے، تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، روز کے روز)، سجانا: (سنوارنا، آراستہ کرنا، زیب و آرائش کرنا، درست کرنا)، کبھی کبھار: (کبھی کبھی، بعض اوقات، گاہے گاہے، شاذ و نادر)، معصوم فخر: (وہ فخر جس میں فریب یا تکبر نہ ہو، سادگی میں اظہارِ شرف کرنا)، دُوبھر ہونا: (دشوار ہونا، وَبال ہونا، مشکل معلوم ہونا)

نمبر 23 ٹھٹھک کر: (چلتے چلتے رک کر، حیرت سے ٹھہر یا جم کر)، خوش نصیب: (خوش قسمت، اچھے نصیب والا، اچھی قسمت والا)، بیاہ: (شادی، عروسی، نکاح اور رخصتی کی تقریب)، چھیڑنے کے لیے: (شرارت کرنا، تنگ کرنے کے لیے، مذاق اور دِل لگی

کے لیے)، پڑھا لکھا: (تعلیم یافتہ)، طوطی بولنا: (شہرت ہونا، دھاک بیٹھنا، نام وری)، امیر کبیر: (امیر ترین، دولت مند، صاحب ثروت، مال دار)، چشم و چراغ: (بہت پیارا بیٹا، آنکھ کا نور، وارث، پسر)، مفلوک الحال: (خستہ حال، تباہ حال، مفلس، قلاش، غریب)، دل و جان سے: (بڑی خوشی سے، شوق و ذوق سے، نہایت شوق سے، بے حد خوشی سے)، منہمک: (کامل توجہ سے کسی کام میں لگا ہونا، مگن، مصروف)، وظیفہ: (وہ روپیہ جو طالب علم کو پڑھائی جاری رکھنے کے لیے دیا جائے، اسکالرشپ، مخصوص امدادی رقم)، میٹریکولیشن: (انگریزی تعلیم کی دسویں جماعت، انٹرینس)، کانوں میں پڑنا: (کسی طرح خبر ملنا، اطلاع ملنا)، منشی: (کلرک، پیش کار، رابطہ کار)، رنگ نکالنا: (قابلیت میں اضافہ کرنا، نمایاں ہونا)، دُھن: (سرشاری، شوق، لگن، سرگرمی)، بلائے ناگہانی: (دفعتاً نازل شدہ مصیبت، ایسی مصیبت جس کا پہلے خیال نہ ہو)، ولایت: (برطانیہ، لندن، انڈیا پر قابض انگریزوں کا ملک جہاں ملکہ برطانیہ رہتی تھی)، ڈرایا: (خوف زدہ کیا)، دھمکایا: (خوف زدہ کیا، خوف دلایا، دھمکی دی)، ٹس سے مس نہ ہونا: (بالکل متاثر نہ ہونا، کوئی اثر نہ ہونا، اپنی بات پر اڑے رہنا)، مفاد: (بھلائی، نفع، فائدہ)، ترجیح دینا: (فضیلت دینا، اہمیت دینا، بہتر سمجھنا، سبقت دینا)، کڑک کر: (گرج کر، ڈپٹ کر، رعب دار آواز سے، سختی سے بولنا)، ٹکا سا جواب دینا: (مطلق انکار کر دینا، صاف جواب دینا، صاف انکار کرنا، قطعی انکار کرنا)، آپے سے باہر ہونا: (غضب ناک ہونا، سخت غصے میں ہونا، سخت ناراض ہونا)، خوب پیٹا: (خوب مارا، نہایت غصے میں مارا پیٹا)، برخاست کرنا: (ملازمت سے برطرف کرنا، فارغ کرنا، نکال دینا)

سبق نمبر 24 سعادت مند: (نیک بخت، مطیع، فرماں بردار، خدمت گزار)، دور افتادہ: (دور دراز مقام پر، بہت دور)، دشوار گزار: (جہاں سے گزرنا مشکل ہو، بہت مشکل، کٹھن، دِقت طلب)، فائز ہونا: (مامور ہونا، کسی عہدے یا منصب پر مقرر ہونا)، سنجوگ: (بندھن، ملاپ، رشتہ یا نسبت ہونا)، اتفاقاً: (اتفاقیہ طور پر، اچانک، بغیر کسی سابقہ ارادے کے)، دانستہ: (جان بوجھ کر، قصداً، شعوری طور پر، جانتے بوجھتے ہوئے)، چھیڑ چھیڑ کر: (دل لگی کرتے ہوئے، تنگ کرتے ہوئے، ہنسی مذاق کرتے ہوئے)، اِصرار کرنا: (کسی بات پر اڑے رہنا، کسی بات پر بضد ہونا، کسی کام کرنے پر زور دینا)، فرمائش: (طلب، مانگ، خواہش)، لین دین: (حساب کتاب، خرید و فروخت)، صدمہ: (رنج و غم، آزار، دکھ، تکلیف، نقصان، اذیت)، یکے بعد دیگرے: (ایک دوسرے کے بعد، لگاتار، مسلسل)، عالمِ شباب میں: (جوانی میں، جوانی کے زمانہ میں)، خون کے آنسو رونا: (اذیت اور تکلیف میں رونا، سخت غمگین ہونا)، کھردری چارپائی: (وہ چارپائی جس پر بچھونا نہ ہو)، یکا یک: (فوراً، ایک دفعہ ہی، اچانک، دفعتاً، یک بیک)، نیم دراز: (ٹیک لگا کر بیٹھنا، جو پوری طرح لیٹا نہ ہو، ترچھا بیٹھا ہوا)، سنجیدہ: (متین، باوقار، مہذب، سلیقہ سے گفت گو کرنے والا)، بہ یک وقت: (ایک وقت میں، ایک ساتھ، اچانک)، خیال امڈ آنا: (اچانک کچھ یاد آنا)، نباہ کیا: (مل جل کر رہے، رفاقت، ساتھ رہے)، قضا و قدر: (حکم الٰہی، مشیتِ الٰہی، تقدیر)، بہی کھاتا: (روزنامچہ، حساب کتاب کا رجسٹر، آمد و خرچ کا حساب)، سر اُٹھایا: (سر اونچا کیا)، قاش: (پھل یا ترکاری کا لمبا تراشا، پھانک، ٹکڑا)، گاؤ تکیہ: (لمبا اور بڑا تکیہ جس سے پشت لگا کر بیٹھتے ہیں)

سبق نمبر 25 چمکارا: (لاڈ اور پیار کیا)، باقی ماندہ: (بچا ہوا، باقی رہا ہوا)، الھڑ دلھن: (چھوٹی عمر کی دلھن، کم سن دلھن)، عقیدت: (اعتقاد، ارادت، خلوص و محبت، کسی بات کو درست اور حق جان کر اس پر دل جمانا)، بیابان: (ویرانہ، اجاڑ خطہ)، تلقین: (ہدایت، ترغیب، نصیحت)، سرگرداں: (حیران و پریشان گھومنے یا چکر لگانے والا)، خیرات: (صدقہ، رقم یا مال جو خدا کی راہ میں مستحقین کو دیا جائے)، گراں: (بہت بیش قیمت)، اہتمام: (انتظام، بندوبست)، بے اختیار: (عاجز، بے بس، مجبور)، ضبط کرنا: (جذبات ظاہر نہ ہونے دینا، برداشت کرنا)

توضیحات

1۔ لائل پور: لائل پور پاکستان کے موجودہ شہر فیصل آباد کا پرانا نام تھا۔ برطانوی دورِ حکومت 1880ء۔1895ء میں دریائے چناب، دریائے راوی کے درمیان ''رچنا دوآبہ'' اور دریائے چناب اور دریائے سندھ کے درمیان ''سندھ ساگر دوآبہ'' کے

ویران اور نیم صحرائی خطوں کو سرسبز و شاداب بنانے کے لیے نہری نظام کا منصوبہ بنایا گیا۔ 1887ء۔1892ء میں لوئر چناب نہر بنائی گئی تو اس وقت پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر جیمز لائل (Sir James Lyall) کے نام پر چناب، راوی اور جھنگ کے درمیان ویران خطے میں چناب کالونیز (Chanab Coloneis) کے تحت ایک شہر بسانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ 1896ء۔ 1898ء میں شہر کا منصوبہ بندی کے ساتھ ڈیزائن بنا۔ شہر کا ڈیزائن برطانیہ کے شہر لندن کے یونین جیک پرچم سے متاثر تھا۔ وسط میں گھنٹہ گھر اور اس سے نکلتے ہوئے آٹھ بازار جو آج بھی اس شہر کو منفرد بناتے ہیں۔ اس شہر کو لائل پور کا نام دیا گیا اور جھنگ کی تحصیل بنا دیا گیا۔ 1904ء میں لائل پور کو باقاعدہ ضلع کا درجہ ملا۔ جلد ہی نہری نظام کی بدولت یہ غیر آباد اور نیم صحرائی خطہ گندم اور کپاس کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اسے ایشیا کی سب سے بڑی، زرعی منڈی بھی کہا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لائل پور میں صنعتیں تیزی سے قائم ہوئیں جن میں ٹیکسٹائل ملز اور پاور لومز نے اس شہر کو ٹیکسٹائل کیپٹل آف پاکستان بنا دیا۔ 1977ء میں حکومتِ پاکستان نے لائل پور کا نام بدل کر سعودی عرب کے بادشاہ فیصل بن عبدالعزیز کے نام پر فیصل آباد رکھ دیا۔

2۔ بار کا علاقہ: ''بار'' پنجابی زبان کا لفظ جس کے معانی بیابان، جنگل اور ویرانہ کے ہیں۔ (پلاک ڈکشنری ص 518) پنجاب کے پرانے غیر آباد اور جنگلاتی یا بیابانی علاقے ''بار'' یا ''باراں'' کہلاتے ہیں۔ یہ علاقے عام زمین سے بلند اور اونچے ہوتے تھے۔ اس وجہ سے ان علاقوں میں کھیتی باڑی کرنا مشکل تھا۔ صرف بارش یا دریا میں طغیانی آنے سے کھیتی باڑی ہوتی تھی اس لیے ان علاقوں کو ''بار'' یا باراں کہا جاتا تھا۔ کھیتی باڑی نہ ہونے کی وجہ سے ان علاقوں کی زمین بنجر اور ریتلی تھی۔ مغربی پنجاب میں نہری نظام سے پہلے غیر آباد علاقے جیسے ساندل بار، گنجی بار، نیلی بار، کڑانہ بار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

3۔ روپڑ: روپڑ بھارتی پنجاب کا تاریخی اور جغرافیائی علاقہ ہے۔ پہلے یہ انبالہ کی تحصیل تھی اب یہ ضلع بن چکا ہے۔ جب کہ انبالہ کو ہریانہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ضلع روپڑ بھارتی پنجاب کا اہم سرحدی ضلع ہے۔ اس کی اہم تحصیلیں، روپ نگر، چمکور صاحب اور آنند پور ہیں۔ علاقہ میں پنجابی کے ماجھی اور دوآبی لہجے بولے جاتے ہیں۔ جی ٹی روڈ اس کے قریب سے گزرتی ہے۔ اس کے قریب ترین شہروں میں موپالی، مکو، انبالہ اور چندی گڑھ شامل ہیں۔ چندی گڑھ پنجاب اور ہریانہ کا مشترکہ دارالحکومت ہے۔ یہاں کی مٹی زرخیز ہے۔ دریائے ستلج پر برطانوی دورِ حکومت میں روپڑ بیراج بنایا گیا تھا جس سے سرہند نہر نکالی گئی تھی۔ قدیم دور میں روپڑ کے بعد دریائے ستلج سات حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ روپڑ مغلیہ اور سکھ دور میں قدیم تجارتی شہر رہا ہے۔

4۔ نہر سرہند: سرہند نہر بھارتی ریاست پنجاب کی ایک بڑی نہر ہے۔ یہ نہر 1882ء میں پنجاب کے شہر روپڑ بیراج سے نکالی گئی تھی۔ یہ نہر روپڑ ضلع روپ نگر سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بڑی نہر آب پاشی کے پانچ بڑے منصوبوں میں سے ایک تھی۔ اس نہر کا مقصد پنجاب کی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا، پانی کا کنٹرول اور زرعی پیداوار کو بڑھانا تھا۔ سرہند نہر کا منبع ضلع روپ نگر کا بیراج ہے۔ 1960ء کے سندھ طاس معاہدے کے بعد دریائے ستلج کا مکمل اختیار بھارت کو مل گیا اور یوں پاکستان کو سرہند نہر کا پانی بند کر دیا گیا۔ سرہند نہر مغلیہ دور کے صوبہ سرہند سے گزرتی ہے اس لیے اس کا نام سرہند رکھا گیا۔

5۔ فیروزہ: فیروزہ غیر شفاف سبزی مائل نیلے رنگ کا پتھر ہے۔ فیروزہ کا شمار دنیا کے قدیم ترین قیمتی پتھروں میں ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر نیلے رنگ میں پایا جاتا ہے۔ یورپ میں یہ پتھر ترکی سے گیا اس لیے انگریزی میں اسے Turquoise کہا جاتا ہے۔ نیلے فیروزہ کو جینی اور سبزی مائل فیروزہ کو رزاتی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ فیروزہ مزید، رنگوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں جامنی اور پیلا فیروزہ قابل ذکر ہیں۔ نیلا فیروزہ سب سے قیمتی گردانا جاتا ہے۔

6۔ خضر: خضر اسلامی اور صوفیانہ روایت میں ایک پراسرار، زندہ، اور روحانی شخصیت ہیں۔ انھیں عام طور پر رہبر راہ، مشکلات میں غیبی مدد فراہم کرنے والے اور سچائی کے معلم کے طور پر مانا جاتا ہے۔ قصص میں وہ آبِ حیات پینے والے مشہور

ہیں، جس کی وجہ سے انھیں دائمی حیات حاصل ہے۔ صوفیانہ فکر میں، خضر کا ظہور باطنی رہنمائی کی علامت ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کا رنگ سبز سے منسوب کیا جاتا ہے، جو تازگی، زندگی، اور علم کی علامت ہے۔

7۔ آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان: آئی سی ایس (Indian Civil Service) کا امتحان برطانوی راج کے دوران ہندوستان کا سب سے بڑا، مشکل، اور باوقار مسابقتی امتحان تھا۔ اس امتحان کو پاس کرنے والے امیدواروں کو وائسرائے کے بعد حکومتِ ہند کے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔ یہ عہدہ ہندوستانیوں کے لیے طاقت، اعلیٰ سماجی رتبے، اور ایک کامیاب کیریئر کی انتہا سمجھا جاتا تھا۔ اس امتحان کا نصاب انتہائی وسیع ہوتا تھا اور اس میں کامیاب ہونے کے لیے عموماً انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

سبق کا خلاصہ

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہیں ہو سکا۔ اندازہ ہے کہ ان کی پیدائش انیسویں صدی کے آخری دس پندرہ برسوں میں ہوئی تھی۔ ان کا آبائی گاؤں منیلہ، ضلع انبالہ میں واقع تھا۔ ان کے والد کے پاس چند ایکڑ زمین تھی جس پر خاندان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ انھی دنوں نہر سرہند کی کھدائی شروع ہوئی اور ان کی زمین اس منصوبے میں شامل ہوگئی۔ حکومت کی طرف سے معاوضہ ملنا تھا لیکن سادگی اور ناواقفیت کی وجہ سے ان کے والد یہ معلوم نہ کر سکے کہ معاوضہ کیسے حاصل کیا جائے۔ آخر کار انھوں نے صبر و شکر سے کام لیا اور مزدوری کرنے لگے۔

اسی دوران میں یہ خبر پھیلی کہ لائل پور کی نئی کالونی میں آباد کاروں کو زمین دی جا رہی ہے۔ بہتر مستقبل کی امید میں ماں جی کے والد اپنے خاندان کو ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہوگئے۔ غربت کے باعث سواری کا انتظام ممکن نہ تھا، اس لیے پورا خاندان پیدل سفر کرتا رہا۔ راستے میں جہاں کام مل جاتا وہیں مزدوری کر کے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا۔ ماں جی کی والدہ سوت کاتتیں اور گھروں کی صفائی ستھرائی کا کام کرتیں جب کہ ماں جی بھی ان کا ہاتھ بٹاتیں۔ اس طویل اور دشوار سفر کے دوران میں وہ کئی مقامات پر بھٹکتے رہے اور لوگوں سے راستہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

کئی ہفتوں کی مسلسل مشقت کے بعد وہ جڑانوالہ پہنچے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ ماں جی کے والد غلہ منڈی میں بوریاں اٹھاتے تھے جب کہ ان کی والدہ چرخہ کات کر روزی کماتیں۔ اسی دوران میں عیدالاضحیٰ کا تہوار آیا۔ ماں جی کے والد نے خوش ہو کر انھیں تین آنے عیدی دی۔ یہ پہلی مرتبہ اتنی رقم ان کے ہاتھ آئی۔ انھوں نے کئی دن تک اس رقم کو سنبھال کر رکھا اور آخر کار گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ان کی عادت بن گئی کہ جب بھی گیارہ پیسے جمع ہوتے تو مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔

ماں جی نہایت سادہ، قناعت پسند اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ ان کے پاس دنیاوی سامان بہت کم تھا۔ چند جوڑے کپڑے، ایک جوڑا جوتا، ایک عینک، ایک تسبیح اور جائے نماز ہی ان کی کل متاع تھی۔ کھانے پینے میں بھی وہ انتہائی سادگی اختیار کرتی تھیں۔ مکئی کی روٹی، پودینے اور دھنیے کی چٹنی اور نمکین لسی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ وہ ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں اور کبھی کسی چیز کی خواہش ظاہر نہ کرتیں۔

جب خاندان کو لائل پور میں زمین ملی تو ان کے حالات بہتر ہوگئے۔ ماں جی کی خوب صورتی، سادگی اور اچھے اخلاق کی وجہ سے ان کے لیے بہت سے رشتے آنے لگے۔ ان کی اپنی خواہش صرف اتنی تھی کہ انھیں ایک پڑھا لکھا شوہر ملے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور ان کی شادی عبداللہ صاحب سے ہوگئی۔ عبداللہ صاحب غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ وہ پنجاب یونی ورسٹی میں میٹرک کے امتحان میں اول آئے اور بعد میں علی گڑھ میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خان نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں انگلستان بھیجنے کا انتظام کیا، لیکن انھوں نے اپنی والدہ کی رضا کو مقدم رکھتے ہوئے اسے قبول نہ کیا۔ بعد میں وہ گلگت میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے۔

منگنی کے بعد ایک میلے میں عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو رقم دینا چاہی لیکن انھوں نے صرف گیارہ پیسے مانگے تاکہ مسجد میں تیل ڈلوا سکیں۔ شادی کے بعد بھی انھوں نے کبھی دولت اور آسائش کی خواہش نہیں کی اور پوری زندگی سادگی سے بسر کی۔ ماں جی کی زندگی میں کئی غم بھی آئے۔ ان کی دو بیٹیاں شادی کے بعد وفات پا گئیں اور ایک جوان بیٹا بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بعد ازاں عبداللہ صاحب کا انتقال بھی ان کی موجودگی میں ہوا۔ ان تمام صدمات کے باوجود انھوں نے صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اپنے بچوں کو بھی صبر اور شکر کی تلقین کرتی رہیں۔ ماں جی نے پوری زندگی عبادت، خدمت، قناعت اور خدا پر توکل میں گزاری۔ ان کی شخصیت سادگی، ایثار، صبر اور شکر کا ایک روشن نمونہ تھی جسے ان کے عزیز ہمیشہ محبت اور احترام سے یاد کرتے رہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

اجمالی سیاق و سباق

مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کا تعلق انبالہ کے ایک گاؤں سے تھا، جہاں غربت اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث ان کا خاندان ہجرت کر کے لائل پور (فیصل آباد) منتقل ہوا۔ انھوں نے زندگی انتہائی مشقت اور کفایت شعاری میں گزاری، جس کی جھلک ان کے طرزِ زندگی میں نمایاں تھی۔ انھیں دنیوی آسائشوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور وہ دوسروں کی خدمت اور بھلائی کو ہی اپنی خوشی سمجھتی تھیں۔ ان کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہوئی جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اصول پسند انسان تھے۔ شادی کے بعد بھی ماں جی کا طرزِ زندگی انتہائی سادہ رہا۔ ان کی زندگی کا خاص پہلو جمعرات کو مسجد میں چراغ کے لیے گیارہ پیسے کا تیل بھجوانا تھا۔ انھوں نے زندگی میں اولاد اور شوہر کی وفات جیسے بڑے صدمے سہے، مگر ہمیشہ صبر و تسلیم کا دامن تھامے رکھا۔

عبارت نمبر 1

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔ جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرفِ عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو ''بار'' کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

حوالۂ متن

سبق کا عنوان: ماں جی

مصنف کا نام: قدرت اللہ شہاب

ماخذ: ماں جی

صنف: افسانہ

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے، اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کا تعلق انبالہ کے ایک گاؤں سے تھا، جہاں غربت اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث ان کا خاندان ہجرت کر کے لائل پور (فیصل آباد) منتقل ہوا۔ انھوں نے زندگی انتہائی مشقت اور کفایت شعاری میں گزاری، جس کی جھلک ان کے طرزِ زندگی میں نمایاں تھی۔ انھیں دنیوی آسائشوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور وہ دوسروں کی

خدمت اور بھلائی کو ہی اپنی خوشی سمجھتی تھیں۔ ان کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہوئی جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اصول پسند انسان تھے۔ شادی کے بعد بھی ماں جی کا طرزِ زندگی انتہائی سادہ رہا۔ ان کی زندگی کا خاص پہلو جمعرات کو مسجد میں چراغ کے لیے گیارہ پیسے کا تیل بھجوانا تھا۔ انھوں نے زندگی میں اولاد اور شوہر کی وفات جیسے بڑے صدمے سہے، مگر ہمیشہ صبر و تسلیم کا دامن تھامے رکھا۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال کسی کو معلوم نہیں، یعنی ایسا کوئی تحریری یا زبانی ریکارڈ موجود نہیں جس سے یقینی طور پر بتایا جا سکے کہ وہ کب پیدا ہوئیں۔ پرانے زمانے میں عام طور پر لوگ اپنے بچوں کی تاریخِ پیدائش یاد نہیں رکھتے تھے۔ دیہاتوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا، سرکاری ریکارڈ کا نظام اتنا منظم نہیں تھا اور لوگوں کی زندگی زیادہ تر کھیتی باڑی یا مزدوری کے گرد گھومتی تھی۔ ان حالات میں کسی کی تاریخِ پیدائش کو یاد رکھنا یا لکھ لینا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ جب لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا تو اس وقت پنجاب کے ہر قصبے سے خستہ حال لوگ وہاں زمین حاصل کرنے کے لیے آ رہے تھے۔ لائل پور، جو آج فیصل آباد کہلاتا ہے، برطانوی دورِ حکومت میں ایک نئی بستی کے طور پر آباد کیا گیا۔ 1880ء میں لائل پور شہر کی بنیاد پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر جیمز لائل نے رکھی۔ انھی کے نام پر اس کا نام لائل پور رکھا گیا۔ یکم ستمبر 1977ء میں اس کا نام تبدیل کر کے سعودی عرب کے حکمران، شاہ فیصل کے نام پر فیصل آباد رکھ دیا گیا۔ انگریز حکومت نے پنجاب میں آبپاشی کے لیے نہریں بنوائیں تاکہ بنجر زمینوں کو زرخیز بنایا جا سکے۔ ان زمینوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسانوں اور محنت کشوں کو کاشت کے لیے دیا گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بہت سے لوگ اپنے آبائی دیہات اور قصبے چھوڑ کر لائل پور کی طرف جانے لگے۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کے پاس اپنے علاقوں میں زمین نہیں تھی یا بہت کم تھی اور وہ بہتر زندگی گزارنے کے لیے نئی جگہوں پر قسمت آزمانا چاہتے تھے۔

اُس وقت لائل پور، جھنگ اور سرگودھا کے علاقوں کو عرفِ عام میں ''بار'' کہا جاتا تھا۔ پنجاب میں ''بار'' ان علاقوں کو کہا جاتا تھا جہاں نہریں نہیں تھیں اور زمین خشک یا بنجر تھی۔ وہاں کی کھیتی باڑی بارش کے پانی پر منحصر تھی۔ ''بار'' کے علاقے میں زندگی کٹھن تھی، پانی کی قلت تھی اور زراعت دشوار تھی۔ جب حکومت نے وہاں نہریں کھدوائیں تو زمین زرخیز ہو گئی اور ان علاقوں کی قسمت بدل گئی۔ وہاں آبادکاری شروع ہوئی، کھیت سرسبز و شاداب ہونے لگے، گاؤں بسنے لگے اور لوگوں نے اپنے گھر بنا لیے۔

جب یہ آبادکاری ہو رہی تھی، اُس وقت ماں جی کی عمر دس یا بارہ سال کے قریب تھی۔ چوں کہ لائل پور کی آبادکاری انیسویں صدی کے آخری عشرے میں شروع ہوئی تھی، اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ماں جی کی پیدائش تقریباً اس صدی کے آخری دس یا پندرہ سالوں میں ہوئی ہوگی۔ یعنی وہ 1880ء سے 1895ء کے درمیان پیدا ہوئیں۔ مصنف نے یہ بات کسی ریکارڈ کے بغیر حالات و واقعات کے مطابق اندازہ لگا کر کہی ہے۔

اس عبارت میں محض ماں جی کی پیدائش کے وقت کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ ایک پورے دور کے سماجی، معاشی اور تاریخی پسِ منظر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اُس وقت کا معاشرہ ایک بڑی تبدیلی سے گزر رہا تھا۔ پنجاب کے لوگ جو صدیوں سے اپنے مخصوص علاقوں میں رہ رہے تھے، اب نئے علاقوں میں جا کر آباد ہو رہے تھے۔ یہ ایک طرح کی ہجرت تھی مگر یہ ہجرت غربت، ضرورت اور بہتر زندگی کی تلاش میں تھی۔ وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہیں تھا، وہ اپنے گھر بار بیچ کر نئی زمین حاصل کرنے کے لیے نکل پڑے تھے۔

اُن کے دل میں یہ امید تھی کہ وہاں جا کر وہ اپنی قسمت بدل سکیں گے۔ رزقِ حلال کی تلاش میں سفر کے حوالے سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

ترجمہ: ''وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو مسخر (فرماں بردار) کیا، تو تم اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اس کا دیا ہوا رزق کھاؤ۔'' (سورۃ الملک:15)

ماں جی انھی حالات میں پلی بڑھیں۔ جب وہ بچی تھیں تو اُنھوں نے دیکھا ہوگا کہ اردگرد کے لوگ اپنی زمینوں کی تلاش میں نکل رہے ہیں، کہیں نہریں کھودی جا رہی ہیں، کہیں لوگ اپنے کھیتوں میں بیج ڈال رہے ہیں، کہیں نئی جھونپڑیاں بن رہی ہیں۔ اس زمانے میں زندگی بڑی سادہ مگر دشوار تھی۔ سہولیات کا نام و نشان نہیں تھا، مگر لوگوں کے دلوں میں محنت کا جذبہ اور زندگی بہتر بنانے کی آرزو تھی۔ بقول شاعر:

؎ پھر امیدوں کو شعاعِ کامرانی کر عطا قسمتِ تاریک کو ہنگامۂ تنویر دے (سید خیر آبادی)

ماں جی کا بچپن اسی محنت اور جدوجہد کے ماحول میں گزرا۔ اُن دنوں عورتوں کی زندگی بھی آسان نہیں تھی۔ گاؤں کی عورتیں گھروں کے کام کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی میں بھی مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ پانی بھرنا، مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، بچوں کی پرورش کرنا، یہ سب کام عورتوں کے ذمے ہوتے تھے۔ تعلیم عام نہیں تھی اس لیے زیادہ تر عورتیں اَن پڑھ ہوتی تھیں۔ لیکن اُن کے اندر صبر، حوصلہ اور محنت کا مادہ زیادہ تھا۔ ماں جی بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی جوانی اور زندگی کے ابتدائی سال ایک ایسے دور میں گزارے جب بنیادی سہولیات بھی دستیاب نہیں تھیں۔ نہ بجلی تھی، نہ پکی سڑکیں، نہ اسکول نہ اسپتال۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو دیسی علاج کرتے، اگر کوئی کام مشکل ہوتا تو سب مل کر اسے انجام دیتے۔ ایسے معاشرے میں رشتے مضبوط تھے اور لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ بقول ظفر گورکھ پوری:

؎ دُکھ سُکھ تھا ایک سب کا اپنا ہو یا بے گانہ ایک وہ بھی تھا زمانہ، ایک یہ بھی ہے زمانہ

عبارت نمبر 2

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہرِ سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہوگئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجامِ کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی کی مزدوری کرنے لگے۔ انھی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہوگئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی اس لیے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کی صحیح تاریخِ پیدائش کا تعین ممکن نہ ہو سکا۔ ان کا بچپن اُس دور کا ہے جب لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا اور پنجاب بھر سے غریب لوگ زمین کے حصول کے لیے بار کے علاقے (لائل پور، جھنگ، سرگودھا) میں جوق در جوق آ رہے تھے۔ اُس وقت ماں جی کی عمر دس بارہ برس تھی، جس کے پیشِ نظر اندازہ یہی ہے کہ وہ پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ برسوں میں پیدا ہوئیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ غربت کے باوجود ماں جی کی دنیا صرف گیارہ پیسے کے تیل اور اللہ کی رضا کے گرد گھومتی تھی۔ ان کی واحد خواہش تھی کہ ایک تعلیم یافتہ جیون ساتھی مل جائے جو عبد اللہ صاحب سے شادی کے بعد پوری ہوئی۔ شوہر کی ذہانت، علی گڑھ کے واقعات، گلگت کی گورنری اور بعد ازاں اولاد کے صدمات کے باوجود، ماں جی نے ہر حال میں صبر و شکر کا دامن تھامے رکھا۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال کسی کو معلوم نہیں، کیوں کہ اُس وقت لوگ تاریخِ پیدائش یاد نہیں رکھتے تھے۔ اندازے کے مطابق وہ اُس زمانے میں پیدا ہوئیں جب لائل پور نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اُس دور میں پنجاب کے مختلف قصبوں اور دیہاتوں سے غریب لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے لائل پور کی طرف آ رہے تھے۔ یہ علاقے جیسے: لائل پور، جھنگ اور سرگودھا، ''بار'' کہلاتے تھے کیوں کہ وہاں زمین بنجر تھی اور کھیتی باڑی صرف بارش کے پانی سے ہوتی تھی۔ بعد میں جب نہریں بنائی گئیں تو زمین زرخیز ہوگئی اور نئی آبادیاں بس گئیں۔ اُس وقت ماں جی کی عمر تقریباً دس یا بارہ سال تھی، اس لیے اندازہ ہے کہ ان کی پیدائش انیسویں صدی کے آخری برسوں میں ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی گاؤں منیلہ تھا جو تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہات تھا جہاں لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ زندگی سادہ مگر مشقت والی تھی۔ وہاں کے باسی اپنی زمینوں کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتے تھے۔ ان کے لیے زمین صرف کھیت نہیں بلکہ عزت، روزگار اور بہتر مستقبل کا ضامن تھی۔ ماں جی کے والدین بھی انھی لوگوں میں سے تھے۔ ان کے پاس چند ایکڑ زمین تھی جس پر وہ کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ انھی کھیتوں میں گزرتا، جہاں دن دھوپ میں اور رات آرام میں بسر ہوتی تھی۔ قرآنِ مجید میں کھیتی باڑی اور مٹی سے رزق اگانے کو بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (سورۃ یٰس:33)

ترجمہ: ''اور ان کے لیے ایک نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے اناج نکالا اور وہ اس میں سے کھاتے ہیں۔''

وقت گزرتا گیا اور ایک دن ان کے علاقے میں ایک بڑی سرکاری سکیم کا آغاز ہوا۔ دریائے ستلج سے ایک نئی نہر نکالی جا رہی تھی جسے ''سرہند نہر'' کہا جاتا تھا۔ اس کا مقصد علاقے کے دوسرے حصوں تک پانی پہنچانا تھا تاکہ کھیتی باڑی کو ترقی دی جا سکے۔ مگر اس منصوبے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بہت سے کسانوں کی زمینیں اس نہر کے راستے میں آ کر ضم ہو گئیں۔ ان زمینوں کو حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ نانا جی کی زمین بھی انھی زمینوں میں شامل تھی۔ ایک کسان کے لیے زمین کا چھن جانا زندگی کی سب سے بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ زمین اس کے لیے محض روزی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کی محنت، عزت و وقار، اس کے خواب اور اس کی شناخت ہوتی ہے۔ جب یہ سب کچھ چھن جائے تو گویا اس کی روح کا ایک حصہ بھی چھن جاتا ہے۔ نانا جی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے ہاتھ سے وہ سب کچھ نکل گیا جو ان کے خاندان کا سہارا تھا۔

انگریز حکومت نے اعلان کیا کہ جن کسانوں کی زمینیں نہر کی کھدائی میں آ گئی ہیں، انھیں معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن نانا جی سیدھے سادے، نیک دل اور بھولے بھالے آدمی تھے۔ انھیں دنیاوی چالاکیوں اور سرکاری دفتروں کے نظام کی سمجھ نہیں تھی۔ وہ دو

تین بار ''روپڑ'' کے شہر گئے تا کہ معاوضہ حاصل کر سکیں، مگر وہ اتنے سادہ طبیعت تھے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انگریز افسر کا دفتر کہاں ہے، کس سے بات کرنی ہے اور کاغذات کہاں جمع کرانے ہیں؟ ان کی سادہ طبیعت نے انھیں ان پیچیدہ معاملات میں الجھنے نہ دیا۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔

انھوں نے کسی سے کوئی گلہ نہیں کیا۔ وہ سمجھ گئے کہ شاید یہی ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ انھوں نے صبر و شکر سے کام لیا اور حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ ان کے لیے شکایت کرنا بے کار تھا۔ انھوں نے اس حقیقت کو قبول کیا کہ قسمت کبھی انسان کے حق میں اور کبھی اس کے خلاف ہوتی ہے۔ مگر ہمت اور محنت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چناں چہ وہ اسی نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔ جس زمین پر کبھی وہ مالک کی حیثیت سے کھڑے ہوتے تھے، اب اسی زمین پر مزدور بن کر کام کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے اسے اپنی توہین نہیں سمجھا بلکہ رزقِ حلال کا ذریعہ بنایا۔ یہ ان کے مضبوط کردار اور قناعت کی علامت تھی۔

اسی دوران میں انھیں خبر ملی کہ لائل پور کے علاقے میں نئی کالونی آباد کی جا رہی ہے جہاں حکومت نئے آنے والوں کو مفت زمینیں دے رہی ہے۔ یہ خبر ان کے لیے امید کی کرن ثابت ہوئی۔ انھوں نے سوچا کہ شاید قدرت نے ان کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ ان کے دل میں پھر سے زندگی کی رمق جاگ اٹھی۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ وہاں جائیں گے اور نئی زندگی کی بنیاد رکھیں گے۔

؎ کوشش بھی کر، امید بھی رکھ، راستہ بھی چن پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر (ندا فاضلی)

نانا جی کے پاس وسائل نہ تھے۔ سواری کا انتظام ممکن نہیں تھا۔ نہ گھوڑا گاڑی، نہ بیل گاڑی، نہ کوئی رقم، لیکن عزم بلند تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سفر لمبا اور کٹھن ہوگا مگر منزل روشن ہے۔ انھوں نے اپنے خاندان کو ساتھ لیا اور پیدل لائل پور کے سفر پر نکل پڑے۔ یہ سفر آسان نہ تھا، راستہ طویل، اجنبی اور دشوار تھا۔ کبھی وہ جنگلوں سے گزرتے، کبھی بیابانوں سے، دھوپ کی تپش، بھوک، پیاس، تھکن، سب کچھ ان کے ساتھ تھا مگر ان کے قدم رکتے نہیں تھے۔

راستے میں جہاں کہیں موقع ملتا، نانا جی مزدوری کر لیتے تا کہ کھانے پینے کا انتظام ہو سکے۔ کبھی وہ قلی کا کام کرتے، یعنی لوگوں کا سامان اٹھاتے، کبھی لکڑی کے ٹال پر جا کر لکڑیاں چیرتے۔ وہ محنت سے نہیں گھبراتے تھے کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ رزق محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ نانی اور ماں جی بھی فارغ نہ بیٹھتیں، وہ سوت کات دیتی تھیں۔ کسی کے گھر جا کر دیواریں یا فرش لیپ دیتی تھیں۔ اس طرح سب مل کر مزدوری کرتے اور اپنا پیٹ پالتے۔

؎ دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے (فیض احمد فیض)

یہ سفر نہ صرف جسمانی بلکہ جذباتی طور پر بھی کٹھن تھا۔ راستے کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ کسی کو صحیح راستہ معلوم نہ تھا۔ نہ کوئی نقشہ تھا، نہ بورڈ، نہ رہنمائی۔ وہ جگہ جگہ بھٹک جاتے، لوگوں سے راستہ پوچھتے اور پھر آگے بڑھتے۔ کبھی غلط سمت میں نکل جاتے اور کئی دنوں کے بعد پتہ چلتا کہ راستہ غلط ہے۔ مگر وہ ہمت نہ ہارتے۔ ان کے دل میں ایک یقین تھا کہ جو لوگ محنت سے گھبراتے نہیں، انھیں منزل ضرور ملتی ہے۔ یہ سفر کئی ہفتوں پر مشتمل تھا۔ ان کے پاؤں چھلنی ہو گئے، کپڑے پھٹ گئے، لیکن ان کا حوصلہ کم نہ ہوا۔ بھوک کے عالم میں کبھی کسی درخت کے نیچے آرام کر لیتے، کبھی کسی خیر خواہ دیہاتی سے تھوڑا سا اناج مل جاتا۔ نانا جی کی زندگی کا یہ دور کٹھن ضرور تھا مگر ان کی روح مضبوط تھی۔ وہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہر دکھ سہنے کو تیار تھے۔

؎ سروں پہ اوڑھ کے مزدور دھوپ کی چادر خود اپنے سر پہ اسے سائباں سمجھنے لگے

عبارت نمبر 3

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے، نانی چرخہ کات کر

سُوت بچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔ انھی دِنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مَصرف ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسّی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کی پیدائش انیسویں صدی کے آخر میں ضلع انبالہ کے گاؤں منیلہ میں ہوئی۔ والد کی زمین نہر کی کھدائی میں جانے اور معاوضہ نہ ملنے پر خاندان معاشی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ لائل پور میں نئی کالونی اور مفت زمین کی خبر سن کر نانا جی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پیدل ہی وہاں روانہ ہو گئے۔ راستے میں یہ خاندان مزدوری اور گھروں میں کام کر کے پیٹ پالتا رہا۔ راستے سے ناواقفیت کے باعث، کئی ہفتوں کی طویل اور کٹھن مسافت طے کر کے یہ خاندان اپنی منزل کی جانب گامزن رہا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی نمود و نمائش سے دور، انتہائی سادہ خوراک کی عادی تھیں اور اولاد کو اللہ کی امانت سمجھتی تھیں۔ ان کی زندگی کی واحد خواہش ایک تعلیم یافتہ شوہر کی تھی جو عبد اللہ صاحب سے شادی پر پوری ہوئی۔ شوہر کی وفات اور اولاد کے دکھوں میں بھی ماں جی صبر و شکر کا پیکر رہیں۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کا آبائی گاؤں منیلہ تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں تھا۔ ان کے والدین کے پاس چند ایکڑ زمین تھی جس پر وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جب دریائے ستلج سے سرہند نہر کی کھدائی شروع ہوئی تو نانا جی کی زمین بھی نہر کے راستے میں آ گئی۔ انگریز حکومت کی طرف سے معاوضہ ملنے کا اعلان ہوا، لیکن نانا جی سیدھے سادے آدمی تھے، وہ دفتر کا راستہ اور طریقہ نہ جان سکے، اس لیے معاوضہ حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے صبر کیا اور اسی نہر کی کھدائی میں مزدوری شروع کر دی۔ بعد میں انھیں خبر ملی کہ لائل پور میں مفت زمینیں مل رہی ہیں تو وہ اپنی بیوی اور بچوں سمیت پیدل وہاں کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں وہ مزدوری کرتے، محنت سے پیٹ پالتے رہے، اس لیے منزل تک پہنچنے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ محنت کر کے رزق کمانے کی اسلام میں بہت فضیلت ہے۔ محنت کش کو اللہ تعالیٰ کا دوست قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو پسند فرماتا ہے، جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے روزی کماتا ہے۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ نانا جی اور ان کا خاندان ڈیڑھ سے دو مہینے کی طویل اور تھکا دینے والی مسافت طے کر کے جڑانوالہ پہنچا۔ اس زمانے میں سفر آج کی طرح آسان نہیں ہوتا تھا۔ لوگ زیادہ تر پیدل چلتے تھے۔ نہ سواری کا انتظام تھا، نہ آرام دہ ٹھکانے، نہ سڑکوں کی سہولت۔ گرمی، دھول، بھوک، پیاس اور تھکن کے باوجود یہ لوگ منزل کی طرف رواں دواں رہتے تھے۔ اسی طرح نانا جی اور ان کا خاندان بھی سخت محنت اور صبر کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اتنی لمبی پیدل مسافت کے بعد جب وہ جڑانوالہ پہنچے تو ان کے جسم تھکن سے چور تھے۔ ہر جوڑ دکھ رہا تھا، پاؤں سوج گئے تھے اور چہروں پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن دل میں یہ سکون ضرور تھا کہ اب وہ ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں جہاں کچھ دن آرام کر سکیں گے۔

؎ یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

جڑانوالہ پہنچنے کے بعد انھوں نے وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ ان کے پاس زیادہ سامان یا پیسہ نہیں تھا، اس لیے روزی روٹی کا انتظام خود ہی کرنا پڑا۔ نانا جی ایک محنتی اور خوددار انسان تھے۔ انھوں نے کسی سے مدد مانگنے کی بجائے اپنی محنت پر بھروسا کیا۔ دن بھر غلہ منڈی میں مزدوری کرتے۔ بوریاں اٹھانا کوئی آسان کام نہیں تھا، خاص طور پر ان کے لیے جو ابھی ابھی طویل سفر طے کر کے آئے ہوں۔ لیکن نانا جی نے کسی قسم کی شکایت نہ کی۔ وہ صبح سویرے کام پر چلے جاتے اور شام کو تھکن سے نڈھال ہو کر واپس آتے۔ پسینے میں شرابور جسم اور چھالوں سے بھرے ہاتھ ان کی محنت کی گواہی دیتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کسی طرح اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔

؎ لہر کے سامنے ساحل کی حقیقت کیا ہے جن کو جینا ہے وہ حالات سے ڈرتے کب ہیں

نانی بھی نانا جی کی طرح محنتی اور باہمت خاتون تھیں۔ انھوں نے بھی گھر بیٹھے روزی کمانے کا ذریعہ تلاش کیا۔ وہ چرخہ کاتتیں اور سُوت تیار کر کے بیچ دیتیں۔ اس زمانے میں عورتیں گھر میں بیٹھ کر یہی کام کیا کرتی تھیں۔ ان کے بنائے ہوئے سُوت سے کپڑا بنتا اور وہ اس محنت کے بدلے چند پیسے کماتی تھیں۔ یوں گھر کا نظام کسی نہ کسی طرح چلنے لگا۔ نانی کے چہرے پر تھکن کے باوجود اطمینان کی جھلک ہوتی تھی کیوں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ محنت ان کے گھر کی خوشی اور عزت کے لیے ہے۔ ماں جی، جو اس وقت ابھی کم عمر تھیں، گھر سنبھالتی تھیں۔ ان کے ذمے جھونپڑے کی صفائی، کھانا پکانا اور روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام تھے۔ وہ بھی اپنے والدین کی طرح صابر اور قناعت والی تھیں۔ جھونپڑا چھوٹا سا تھا، جس میں شاید ایک یا دو چارپائیاں، چند برتن اور کچھ ضروری سامان تھا۔ مگر ان سب کے لیے وہی چھوٹا سا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا، کیوں کہ یہ ان کی اپنی محنت سے حاصل کیا گیا ٹھکانا تھا۔

؎ اک جست میں تو کوئی نہ پہنچا کمال تک اک عمر سر کھپا کے ہی جو کچھ ملا ملا

ایسے ہی دن گزرتے رہے۔ محنت، تنگدستی اور غربت ان کی زندگی کا حصہ تھی، لیکن دل مطمئن تھے۔ پھر بقر عید کا تہوار آیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے خوشی اور قربانی کا دن ہوتا ہے۔ عام طور پر اس موقع پر لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں، گوشت پکاتے اور ایک دوسرے کو عیدی دیتے ہیں۔ مگر غریبوں کے لیے یہ خوشی بھی اکثر ایک آزمائش بن جاتی ہے۔ نانا جی نے بڑی محنت سے چند روپے جمع کیے تھے۔ وہ زیادہ نہیں تھے، لیکن ان کے لیے ان کی بڑی اہمیت تھی۔ ان پیسوں میں سے نانا جی نے اپنی بیٹی یعنی ماں جی کو تین آنے عیدی کے طور پر دیے۔

تین آنے آج کے لحاظ سے شاید کوئی قیمت نہ رکھتے ہوں، لیکن اس وقت کے حالات میں یہ بہت بڑی بات تھی۔ ماں جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار ان کے ہاتھ میں اتنے پیسے آئے تھے۔ یہ رقم ان کے لیے ایک قیمتی خزانے سے کم نہ تھی۔ وہ بار بار اس رقم کو دیکھتیں، الٹ پلٹ کر گنتیں، مگر سمجھ نہیں آتا تھا کہ ان پیسوں سے کیا کریں۔ ان کے معصوم دل میں شاید یہ احساس بھی تھا کہ یہ محنت سے کمائے گئے پیسے ہیں، انھیں فضول خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سوچتی رہیں کہ اس رقم کو کیسے خرچ کیا جائے، مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔

دراصل ان کے دل میں پیسوں کی حرص نہیں تھی بلکہ ان کے پیچھے چھپی محبت اور محنت کی قدر تھی۔ زمانہ گزرتا گیا۔ جب وہ بوڑھی ہوئیں، تب بھی پیسے کی زیادہ سمجھ ان کے لیے مشکل ہی رہی۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال کے قریب تھی، لیکن ان کے لیے نوٹوں کی پہچان آسان نہیں تھی۔ وہ سو، دس، یا پانچ روپے کے نوٹ میں فرق کرنے میں مشکل محسوس کرتی تھیں۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں پیسہ کبھی زیادہ اہم نہیں رہا۔ وہ دنیاوی آسائشوں اور دولت کی چمک دمک سے دور رہیں۔ ان کے نزدیک سکون اور اطمینان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جیب میں زیادہ پیسہ ہو بلکہ یہ کہ دل صاف ہو، زندگی میں صبر ہو اور محنت سے روٹی کھائی جائے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

"امیری مال کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اصل امیری تو دل کا غنی ہونا ہے۔" (صحیح بخاری)

ان کی زندگی محنت، سادگی اور قناعت کی بہترین مثال تھی۔ وہ دور ایسا تھا جب لوگ تھوڑی سی چیزوں میں بھی خوش رہنا جانتے تھے۔ کسی چیز کی کمی پر افسوس کرنے کی بجائے، جو میسر ہوتا، اسی پر شکر ادا کرتے تھے۔ نانا جی اور نانی کی زندگی بھی اسی اصول پر گزری۔ دونوں نے اپنے حصے کی مشقت برداشت کی، مگر کبھی شکوہ نہ کیا۔ رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"وہ شخص کامیاب ہو گیا جو اسلام لایا اور اسے بہ قدرِ کفایت رزق دیا گیا اور پھر دیے ہوئے رزق پر اللہ تعالیٰ نے اسے قناعت کی توفیق دی۔" (صحیح مسلم)

مختصر یہ کہ اگرچہ حالات مشکل ہوں، لیکن صبر، محنت اور شکر گزاری سے انسان اپنی زندگی کو خوب صورت بنا سکتا ہے۔ نانا جی، نانی اور ماں جی نے غربت میں رہ کر بھی عزت کی زندگی گزاری۔ ان کے دل مطمئن اور ایمان سے بھرپور تھے۔ ان کے لیے تین آنے کی عیدی صرف پیسہ نہیں بلکہ محبت، قربانی اور زندگی کے سادہ حسن کی علامت تھی۔ خوشی دولت سے نہیں، دل کی پاکیزگی، محنت اور قناعت سے حاصل ہوتی ہے۔

عبارت نمبر 4

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں، ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسا اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے تو وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔

اسبابِ دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سُوتی کپڑے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ نانا جی کی زرعی زمین نہرِ سرہند کی نذر ہونے پر معاشی تنگی کے باعث ان کا خاندان لائل پور ہجرت پر مجبور ہوا۔ راستے بھر یہ خاندان محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا رہا اور جڑانوالہ پہنچا۔ وہاں نانا جی نے غلہ منڈی میں مزدوری کی اور نانی نے سوت کات کر گھر چلایا۔ بقرعید کی تین آنے عیدی ماں جی کے لیے پہلی بڑی رقم تھی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی انتہائی قناعت پسند تھیں اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ دوسروں کی حاجت روائی ان کا شیوہ تھا، حتیٰ کہ اپنے بچوں کے لیے بھی انھوں نے کچھ نہیں مانگا۔ اولاد کے دکھوں اور شوہر کی وفات کے باوجود انھوں نے کمال صبر، ضبط اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے "ماں جی" سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ نانا جی اور ان کا خاندان ڈیڑھ دو مہینے کی لمبی پیدل مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچا ہے۔ سفر کی تھکن اور محنت نے سب کے جسم نڈھال کر دیے تھے۔ وہاں پہنچ کر نانا جی نے غلہ منڈی میں مزدوری شروع کی، نانی نے چرخہ کات کر سوت بیچنے کا کام کیا اور ماں جی نے گھر کی مشقت والی ذمہ داری سنبھالی۔ زندگی انتہائی سادہ مگر مشقت بھری تھی۔ انھی دنوں بقرعید آئی تو نانا جی نے ماں جی کو تین آنے عیدی کے طور پر دیے۔ یہ ان کی زندگی کی پہلی عیدی تھی، جسے پا کر وہ بہت خوش ہوئیں مگر سمجھ نہ سکیں کہ ان پیسوں کا کیا کریں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کو عید کے موقع پر عیدی کے تین آنے ملے۔ اس زمانے کے لحاظ سے تین آنے کوئی بڑی رقم نہیں تھی، لیکن ان کے لیے یہ رقم قیمتی تھی کیوں کہ یہ عید کی خوشی میں ملی تھی۔ عام طور پر لوگ ایسی عیدی کسی شوق، خواہش یا معمولی ضرورت پر خرچ کر دیتے ہیں، لیکن ماں جی نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے ان پیسوں کو احتیاط سے اپنے دوپٹے کے ایک کونے میں باندھ کر محفوظ کر لیا۔ یہ ان کی طبیعت کی سادگی اور کفایت شعاری تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ہر چیز اللہ کی امانت ہے اور اسے بہتر مصرف میں لگانا چاہیے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ پیسے کم ہوں یا زیادہ، اگر انھیں نیکی کے کام میں استعمال کیا جائے تو وہ بابرکت بن جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نیکی کی راہ میں مال خرچ کرنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانے کی سی ہے جس نے سات بالیاں اگائیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (ثواب کو) بڑھاتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''
(سورۃ البقرہ: 261)

جب ماں جی جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں تو انھوں نے انھی پیسوں میں سے گیارہ پیسے کا تیل خریدا اور مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ یہ ان کا پہلا عمل تھا جو وہ نیکی اور عقیدت کے جذبے سے کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے پاس باقی ایک پیسہ رکھا۔ انھوں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جب بھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہوں گے تو وہ فوراً مسجد کے لیے تیل بھجوائیں گی۔ یہی عمل ان کی زندگی کا مستقل معمول بن گیا۔

دراصل ماں جی نے اپنی عیدی کو دنیاوی چیزوں پر خرچ کرنے کی بجائے دین کے کام میں لگایا۔ انھوں نے اللہ کے گھر کو روشن رکھنے کے لیے اپنے حصے کا چراغ جلایا۔ ان کے اس عمل میں دکھاوا یا شہرت کی خواہش بالکل نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ اصل نیکی وہی ہے جو خالص نیت سے کی جائے اور جسے صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ کیوں کہ نیکی کا انحصار مال کی مقدار پر نہیں بلکہ نیت کے خلوص پر ہوتا ہے۔ ماں جی نے اس نیکی کو ایک وقتی عمل نہیں بنایا بلکہ ساری عمر اس کی پابند رہیں۔ جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے تو وہ بڑے شوق سے مسجد کے لیے تیل بھجواتی تھیں۔ وہ یہ کام بڑے اہتمام اور سکون کے ساتھ جمعرات کی شام کو کرتیں۔ ان کے دل میں یہ خواہش رہتی کہ مسجدوں کے چراغ ہمیشہ روشن رہیں۔

رات ہے برسات ہے مسجد میں روشن ہے چراغ
پڑ رہی ہے روشنی بھیگی ہوئی دیوار پر (احسان دانش)

ان کی نیکی کا یہ عمل صرف ایک رسم کے طور پر نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما تھا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ مسجدوں میں جلنے والے چراغ دراصل ایمان، روشنی اور ہدایت کی علامت ہیں۔ وہ اس روشنی کو قائم رکھنے کے لیے ساری عمر کوشش کرتی رہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف مزید بتاتے ہیں کہ ماں جی کے پاس چند آنوں کے علاوہ کوئی زیادہ رقم یا قیمتی زیور نہیں تھا۔ ان کے لیے دولت جمع کرنا یا زیورات بنوانا ضروری نہیں تھا۔ وہ دنیاوی سامان سے بے نیاز تھیں۔ دنیا کے مال و متاع کو وہ عارضی سمجھتی تھیں اور یہی احساس انھیں دنیاوی لالچ سے بچائے رکھتا تھا۔ ان کی زندگی کا محور دنیا نہیں بلکہ ایمان، عبادت اور انسانیت تھی۔ وہ کم چیزوں میں بھی خوش رہتیں اور کبھی شکوہ نہ کرتیں۔ ان کے پاس دنیا کے ساز و سامان میں صرف چند گنتی کی چیزیں تھیں۔ ان چیزوں میں تین جوڑے سوتی کپڑے شامل تھے۔ وہ نہ فیشن کی دل دادہ تھیں، نہ نئے کپڑوں کی خواہش رکھتی تھیں۔ سوتی کپڑے عام اور سادہ ہوتے ہیں، جن میں نہ دکھاوا ہوتا ہے نہ نمود و نمائش۔ ان کی سادگی میں ہی ان کی عظمت چھپی ہوئی تھی۔ وہ سادگی کو اپنا زیور سمجھتی تھیں۔ یہی کپڑے ان کے لیے کافی تھے۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِيِّينَ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (صحیح مسلم:2564)

ترجمہ: ''بے شک اللہ تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''

ان کے پاس ایک جوڑا دیسی جوتا تھا۔ دیسی جوتا عام طور پر دیہاتی یا متوسط طبقے کے لوگ پہنتے ہیں۔ یہ سادہ مگر پائیدار ہوتا ہے۔ اس جوتے کا ذکر اس لیے اہم ہے کہ یہ ماں جی کی سادہ زندگی کا ایک حصہ تھا۔ ان کے لیے ضرورت زیادہ اہم تھی، نہ کہ دکھاوا۔ ان کے پاس ایک جوڑا ربڑ کے چپل بھی تھے۔ یہ چپل عام گھریلو خواتین استعمال کرتی ہیں۔ ان کے پاس ایک عینک تھی، جو ان کی عمر اور زندگی کے تجربے کی نشانی تھی۔ عینک صرف ضرورت کے لیے تھی، آرائش یا فیشن کے لیے نہیں۔ ان کی ایک انگوٹھی تھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ یہ ان کے پاس واحد زیور تھا، لیکن اس میں بھی سادگی نمایاں تھی۔ اس انگوٹھی کی اہمیت مادی نہیں بلکہ جذباتی تھی۔ شاید یہ کسی کی یادگار تھی یا ان کی پسندیدہ چیز۔ ان کے پاس ایک جائے نماز اور ایک تسبیح بھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں ان کی عبادت گزاری، ایمان اور روحانیت کی علامت ہیں۔ ان کی زندگی کا اصل مرکز دنیا نہیں بلکہ اللہ کی یاد اور عبادت تھی۔ وہ دنیاوی مصروفیات سے زیادہ اللہ کے ذکر میں سکون پاتیں۔ تسبیح ان کی روحانی رفیق تھی اور جائے نماز ان کے دل کا سکون۔ ان کے لیے یہ چیزیں زیور سے زیادہ قیمتی تھیں۔ بقول شکیل بدایونی:

؎ زہے تمنا کہ میری فطرت اسیرِ حرص و ہوس نہیں ہے　　بس اک نگاہِ کرم ہے کافی اگر انھیں پیش و پس نہیں ہے

عبارت نمبر 5

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں، اکثر و بیشتر دوپہر کا، شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسّی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی انیسویں صدی کے آخر میں انبالہ میں پیدا ہوئیں۔ نانا جی کی زمین ضائع ہونے پر خاندان نئی زندگی کی تلاش میں لائل پور پیدل روانہ ہوا۔ راستے بھر مشقت کی اور جڑانوالہ میں قیام کیا۔ بقرعید کی تین آنے کی عیدی انھوں نے مسجد میں تیل ڈالنے کے لیے وقف کر دی۔ عمر بھر انتہائی سادہ زندگی گزارنے والی ماں جی کے پاس دنیوی اسباب نہ ہونے کے برابر تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی درویش صفت خاتون تھیں جو دوسروں کی حاجت روائی اور فلاح کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی تھیں۔ عبد اللہ صاحب سے ان کا رشتہ قناعت اور تقدس کا عملی نمونہ تھا۔ انھوں نے زندگی کے کٹھن صدمات صبر و رضا سے برداشت کیے اور اپنے پیچھے عقیدت کی ایک لازوال مثال چھوڑ گئیں۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی دنیاوی دکھاوے اور بناوٹ سے دور، نہایت قناعت پسند اور منکسر المزاج خاتون تھیں۔ کسی بھی سفر پر روانہ ہونے کے لیے وہ کبھی دیر نہ کرتیں، بس چند منٹوں میں کپڑوں کی ایک چھوٹی پوٹلی بنا تیں، اسے جائے نماز میں لپیٹتیں اور تیار ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیے سہولت اور آرام سے زیادہ سادگی اہم تھی۔ جب ان پر آخرت کا سفر آیا تو اسی انداز میں انھوں نے

رخصتی کی تیاری کی۔ انھوں نے اپنے کپڑے خود دھوئے، صاف لباس پہنا اور چند لمحوں بعد پرسکون انداز میں دنیا سے چلی گئیں۔ ان کی زندگی اور موت دونوں سادگی، ایمان، صبر اور خودداری کی مثال تھیں۔

؎ جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (غالبؔ)

ماں جی کا کھانا پینا بہت سادہ اور عام تھا۔ انھیں نفیس کھانوں، لذیذ پکوانوں یا کسی خاص ڈش کا شوق نہیں تھا۔ ان کی پسندیدہ خوراک مکئی کی روٹی تھی جسے وہ دھنیے اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ شوق سے کھاتی تھیں۔ یہ سادہ سا کھانا ان کی طبیعت کے سکون اور سادگی کی علامت تھا۔ مکئی کی روٹی ایک دیہاتی اور سادہ خوراک ہے جو عام طور پر محنت کش لوگ کھاتے ہیں اور یہی بات ماں جی کی سادگی کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ دکھاوے یا شان و شوکت والی زندگی سے دور تھیں، بلکہ انھیں تو سادہ اور قدرتی چیزوں میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔

وہ دوسری چیزیں بھی خوشی سے کھا لیتی تھیں، مگر ان میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ ان کی طبیعت میں لذت پسندی نہیں تھی، بلکہ وہ اس بات پر قناعت کرتی تھیں کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے، وہی ان کے لیے بہتر ہے۔ ان کے لیے کھانا ایک ضرورت تھی، عیش یا لذت نہیں۔ وہ جب بھی کھانا کھاتیں تو ہر لقمے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ یہ عادت ان کے ایمان کی پختگی، دل کے اطمینان اور روحانی تربیت کا مظہر تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ رزق کی اصل اہمیت اس کے ذائقے یا مقدار میں نہیں بلکہ اس شکر میں ہے جو دل سے ادا کیا جائے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے شکرگزاری کی اہمیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (سورۃ ابراہیم:07)

ترجمہ: ''اگر تم شکرگزاری کرو گے تو یقیناً میں تمھیں اور زیادہ دوں گا۔''

پھلوں کے معاملے میں بھی ان کی طبیعت نہایت سادہ اور بے تکلف تھی۔ وہ پھل شوق سے نہیں کھاتی تھیں۔ اگر کبھی گھر والے بہت اصرار کرتے تو بمشکل تھوڑے سے پھل کھا لیتیں۔ ان کے نزدیک یہ سب چیزیں زندگی کی ضرورت نہیں بلکہ عیش و عشرت کی علامت تھیں۔ کبھی کبھار اگر دل چاہتا تو وہ کیلے کی فرمائش کرتیں اور وہ بھی بس ایک ہلکی سی خواہش کے طور پر۔ ان کے اندر خواہشات کا طوفان نہیں تھا، بلکہ دل میں قناعت اور اطمینان کی دولت تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ انسان کی اصل خوشی لذتوں میں نہیں بلکہ دل کے سکون اور سادگی میں ہے۔

ماں جی کے دن کا معمول تھا کہ وہ صبح کے وقت دو پیالے چائے پیتیں اور دوپہر کے بعد یا تیسرے پہر ایک پیالہ سادہ چائے کا ضرور پیتیں۔ ان کے لیے چائے صرف ایک مشروب نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ تھی۔ چائے پینے کا وقت ان کے لیے سکون اور تسکین کا وقت ہوتا۔ ان کے مزاج میں نظم و ضبط تھا۔ وہ ہر کام مقررہ وقت پر کرتیں۔ ان کا یہ معمول ان کی سادہ اور منظم زندگی کا عکاس تھا۔ کھانے کے معاملے میں ان کا اصول یہ تھا کہ وہ دن میں صرف ایک وقت کھانا کھاتیں۔ زیادہ تر دوپہر کو کھانا کھاتیں اور کبھی کبھار ہی رات کو کچھ کھاتی تھیں۔

وہ سمجھتی تھیں کہ کھانا ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھیں کہ زیادہ کھانا جسم اور روح دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ ان کے نزدیک کم کھانا صحت اور سکون کی ضمانت تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمانِ مبارک ہے:

''اگر تم تندرست رہنا چاہتے ہو تو بھوک باقی ہو تو کھانے سے ہاتھ اُٹھا لو۔''

گرمیوں کے موسم میں ان کی پسندیدہ خوراک بہت ہلکی اور سادہ ہوتی تھی۔ وہ مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک یا دو سادہ چپاتیاں کھاتیں۔ ماں جی ہمیشہ موسم اور جسم کی ضرورت کے مطابق کھانا پسند کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ قدرت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا ہی انسان کے لیے بہتر ہے۔ ان کے کھانے پینے کے انداز سے ان کی شخصیت کی کئی خوبیاں ظاہر

ہوتی ہیں۔ان میں سب سے نمایاں ان کی قناعت پسندی تھی۔وہ ہمیشہ جو میسر ہوتا، اسی پر راضی رہتی تھیں۔ان کے نزدیک رزق کی کمی یا زیادتی کا تعلق نصیب سے ہے، اس پر راضی رہنا ایمان کی نشانی ہے۔وہ نہ کبھی کسی چیز کے لیے ضد کرتیں اور نہ کبھی ناشکری کرتیں۔اگر گھر میں معمولی سا کھانا بھی ہوتا تو وہ خوشی سے کھاتیں اور شکر ادا کرتی تھیں۔ماں جی کا یہ طرزِ عمل آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سیرت کے عین مطابق تھا۔صحیح بخاری میں آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کو مرغوب ہوتا تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔''

مختصر یہ کہ انسان اگر کم میں خوش رہنا سیکھ لے تو کبھی غمگین نہیں ہوتا۔لذتوں کے پیچھے بھاگنے والا انسان کبھی مطمئن نہیں ہوتا، مگر قناعت کرنے والا ہر حال میں شکر گزار رہتا ہے۔ماں جی نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کیا کہ سادگی اور شکر گزاری ہی زندگی کی اصل زینت ہے۔وہ اس بات کی جیتی جاگتی مثال تھیں کہ سادہ زندگی ہی دراصل خوش حال زندگی ہے۔

عبارت نمبر 6

دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ دعا کرتی تھیں، ''سب کا بھلا''۔خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لیے انھوں نے براہِ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔پہلے دوسروں کے لیے مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی ''میرے بیٹے'' یا ''میری بیٹی'' کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ روپڑ میں زمین سے محرومی کے بعد، نانا جی اہلِ خانہ کے ہمراہ لائل پور کے سفر پر پا پیادہ روانہ ہوئے۔یہ مہینوں پر محیط سفر نہایت کٹھن تھا، جس میں خاندان نے جگہ جگہ مزدوری کر کے گزر بسر کی۔جڑانوالہ میں ماں جی نے اپنی پہلی عیدی کے تین آنوں کو مسجد میں تیل کے لیے وقف کر دیا۔ان کی بقیہ زندگی نہایت سادہ، زاہدانہ اور شکر گزاری سے عبارت تھی۔وہ گنتی کی اشیا اور سادہ غذا پر اکتفا کرتیں اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی ایک خوش حال گھرانے سے تھیں اور تعلیم یافتہ جیون ساتھی کی خواہش مند تھیں۔جو عبد اللہ صاحب سے شادی پر پوری ہوئی۔شادی کے بعد دونوں نے صبر وشکر کے ساتھ زندگی بسر کی۔عبد اللہ صاحب کا انتقال ماں جی کی موجودگی میں ہوا، جس کے بعد مصنف نے ان کی جذباتی یادوں کو بیان کیا ہے۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی کھانے پینے میں نہایت سادہ تھیں، انھیں کسی خاص یا قیمتی کھانے کا شوق نہیں تھا۔ان کی پسندیدہ غذا مکئی کی روٹی تھی جو وہ دھنیے اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ خوشی سے کھاتیں۔وہ ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتیں اور ہمیشہ قناعت سے کام لیتی تھیں۔پھلوں میں ان کی دل چسپی بہت کم تھی۔ناشتے میں دو پیالے چائے پینا ان کی عادت تھی، جب کہ شام کو ایک پیالہ سادہ چائے ضرور پیتیں۔وہ دن میں صرف ایک وقت کھانا کھاتیں، زیادہ تر دوپہر کو کھاتی تھیں۔گرمیوں میں ان کی پسندیدہ خوراک نمکین لسی اور سادہ چپاتی تھی۔ان کی زندگی سادگی، شکر اور اطمینانِ قلب کی اعلیٰ مثال تھی۔کسی مفکر کا قول ہے:

''صبر، قناعت اور اللہ کا شکر ادا کرنے والے کا دل اطمینان اور سکون سے معمور رہتا ہے۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی میں حسد یا لالچ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتی تھیں کہ دوسروں کو زیادہ ملا اور انھیں کم۔ بلکہ وہ دل سے شکر ادا کرتیں اور دوسروں کے لیے دعا کرتیں۔ ان کا دل بہت وسیع تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اللہ سب کو خوش رکھے۔ ان کے کردار میں ایثار کا جذبہ اتنا نمایاں تھا کہ وہ اپنی خوشی اور ضرورت پر ہمیشہ دوسروں کو مقدم رکھتی تھیں۔ اگر کبھی اپنے بچوں کے لیے بھلائی کی دعا کرتیں تو اس سے پہلے وہ مخلوقِ خدا کی بھلائی مانگتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جب خدا سب کو نوازے گا تو ان کے بچے بھی اس کی رحمت سے محروم نہیں رہیں گے۔

؎ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

ماں جی کی عادت تھی کہ وہ کبھی اپنے یا اپنے بچوں کے لیے براہِ راست کچھ نہیں مانگتی تھیں۔ وہ ہمیشہ دعا میں سب کا بھلا چاہتی تھیں۔ ان کے دل میں خود غرضی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی ذات تک محدود نہیں تھیں، بلکہ ان کا دل پوری انسانیت کے لیے دھڑکتا تھا۔ ان کی دعا کا انداز بھی منفرد تھا، پہلے دوسروں کے لیے اور پھر بالواسطہ اپنے بچوں کے لیے۔ ان کے نزدیک نیکی یہی تھی کہ انسان دوسروں کی بھلائی چاہے۔ انھوں نے کبھی اپنی اولاد کو فخر یا ملکیت کے طور پر نہیں دیکھا۔ وہ کبھی ''میرا بیٹا'' یا ''میری بیٹی'' نہ کہتیں، بلکہ ہمیشہ ''اللہ کا مال'' کہتی تھیں۔ ان کا یہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اولاد کو اپنی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی امانت سمجھتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ دنیا میں ہر چیز عارضی ہے اور اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کی یہ سوچ اس بات کی علامت تھی کہ ان کا ایمان بہت مضبوط تھا اور ان کی سوچ میں روحانیت رچی بسی تھی۔

ان کا دل احسان مندی اور شکر گزاری سے معمور تھا۔ ماں جی جانتی تھیں کہ بندوں کا شکر گزار ہونا بھی اللہ کی شکر گزاری کا ایک طریقہ ہے۔ ارشادِ نبوی خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ ہے:

مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ (سننِ ترمذی)

ترجمہ: ''جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔''

ماں جی کے مزاج میں سادگی اور درویشی کا یہ امتزاج، فطری تھا اور زندگی کے تجربات سے نکھرا تھا۔ قدرت نے انھیں ایک صاف، نرم اور عاجز دل عطا کیا تھا، زمانے کی سختیوں اور زندگی کے نشیب و فراز نے ان کے اندر مزید صبر، تحمل اور قناعت پیدا کی۔ وہ مشکلات کو شکایت کی بجائے صبر اور شکر سے برداشت کرتیں۔ ان کی زندگی میں دکھ ضرور آئے، لیکن ان کے چہرے پر کبھی مایوسی یا شکوہ ظاہر نہیں ہوا۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ شکر کے الفاظ اور دل میں دعا کے جذبات رہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (سورۃ الطلاق:3)

ترجمہ: ''اور جو کوئی اللہ پر توکل (بھروسا) کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔''

ماں جی دنیاوی طاقتوں یا ظاہری سہولتوں پر نہیں بلکہ اللہ کے کرم پر بھروسا کرتی تھیں۔ یہی ان کی درویشی کا اصل مفہوم تھا، دنیا کے ظاہری سہاروں سے بے نیاز ہو کر صرف خدا پر بھروسا رکھنا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوب صورتی ان کی قناعت تھی۔ انھیں جو کچھ بھی ملتا، اسی میں خوش رہتیں۔ نہ شکایت کرتیں، نہ حسد۔ وہ مانتی تھیں کہ جو کچھ ملا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہے اور اس میں ہی بھلائی ہے۔ ان کی یہ سوچ ان کے دل کے سکون کا راز تھی۔ ان کی باتوں میں ٹھہراؤ اور چہرے پر اطمینان ہمیشہ نظر آتا تھا۔

؎ خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے اے اکبر یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد (اکبر الٰہ آبادی)

عبارت نمبر 7

مثلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا، عزیز و اقارب کو تحائف دیے، دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لیے بَر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چناں چہ چاروں طرف سے ماں جی کے لیے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے

ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لیے نانی جی انھیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دُلھنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔ کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے لیے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں، ''ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ مَیں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے: یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے! کون خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔'' ''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا!'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔ ''توبہ توبہ پُت!'' ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی''۔ ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہو گئی۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی قناعت اور سادگی کی پیکر تھیں۔ روپڑ سے لائل پور تک کا کٹھن سفر محنت مزدوری سے طے کیا۔ عیدی کے پیسوں سے مسجد میں چراغ روشن کرنے کی روایت تاحیات قائم رکھی۔ ان کا اثاثہ چند سادہ اشیا تھیں اور وہ ہمیشہ شکر گزار رہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کی دعا کرتیں، اولاد کو اللہ کا مال سمجھتیں اور کبھی اپنی ذات کے لیے کچھ نہ مانگا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب نے والدہ کی خاطر سرسید کی ناراضی مول لی اور محنت سے گلگت کے گورنر بنے۔ ان کی اور ماں جی ازدواجی زندگی میلے میں گیارہ پیسے کے لین دین سے شروع ہو کر نہایت سادگی سے گزری۔ یہ کہانی صدمات، صبر اور ان کی باہمی عقیدت و محبت کی لازوال داستان ہے۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی ایک سادہ، قناعت پسند اور خوش مزاج خاتون تھیں جنھیں مہنگے یا پر تعیش ماحول میں رہنا پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور سادہ زندگی میں خوش رہتی تھیں۔ ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کے دوران میں وہ فوراً ہم سفر عورتوں اور بچوں کے ساتھ گھل مل جاتیں، باتیں کرتیں اور خوش رہتی تھیں، جب کہ ائیر کنڈیشن والے ڈبے میں ان کے لیے سفر تھکن اور بے چینی کا سبب بنتا تھا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ منیلہ پہنچنے پر نانا جی نے اپنے آبائی مکان کی مرمت اور انتظامات کیے تاکہ خاندان کے لوگ آرام اور سکون سے رہ سکیں۔ عزیز و اقارب سے ملاقاتیں ہوئیں، تحائف دیے گئے اور دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے خاندان میں محبت اور خلوص قائم رہا۔ اسی دوران میں ماں جی کے لیے شادی یا رشتہ تلاش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماں جی کی شخصیت میں سادگی، صبر، دوسروں کے ساتھ قربت اور دوستانہ رویہ نمایاں تھا جو انھیں دوسروں کے درمیان مقبول اور پسندیدہ بناتا تھا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بہت شہرت تھی۔ یہ لوگ زمین دار اور مالدار سمجھے جاتے تھے اور معاشرتی لحاظ سے بہت معزز شمار ہوتے تھے۔ ان کا رعب اور اثر برادری میں بہت زیادہ تھا۔ ماں جی کا خاندان دوسروں کی نظر میں خوش نصیب اور باعزت سمجھا جاتا تھا۔ ماں جی کی زندگی ایک خاص شان و شوکت کے ساتھ گزرتی تھی اور وہ خود بھی اپنی حیثیت اور وقار پر

فخر محسوس کرتی تھیں۔ نانی جی ماں جی کی خوش نما اور باوقار شخصیت کو ہر دن نکھارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ ماں جی کو ہر روز نت نئے کپڑے پہنا کر سجاتیں، جیسے دلہن کو تیار کیا جاتا ہے۔ اسلام میں اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کی اجازت ہے بشرطیکہ اس میں تکبر نہ ہو۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کا ارشادِ مبارک ہے:

إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ (صحیح مسلم)

ترجمہ: ''بے شک اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند فرماتا ہے۔''

ان کا مقصد صرف ماں جی کو خوب صورت بنانا نہیں تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ گاؤں اور برادری والے دیکھیں اور ماں جی کے خاندان کی عظمت اور وقار کا احساس کریں۔ اس زمانے میں لڑکی کی شان و شوکت اکثر اس کے کپڑوں، زیورات اور سلیقے سے جانی جاتی تھی، اور ماں جی ہر لحاظ سے مثالی تھیں۔ وہ ہمیشہ خوب سج سنور کر رہتی تھیں تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر متاثر ہوں اور ان کے خاندان کے رعب و دبدبے کا خوب اثر پڑے۔

؎ وہ خوش لباس بھی خوش دل بھی خوش ادا بھی ہے مگر وہ ایک ہے کیوں اس سے یہ گلہ بھی ہے

ماں جی اکثر فخر سے کہتیں کہ جب وہ گاؤں کی سڑکوں سے گزرتیں، لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے: ''یہ خیال بخش مربعے دار کی بیٹی ہے۔ دیکھیے! کون خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔'' یہ منظر ماں جی کے دل میں فخر اور خوشی پیدا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اس توجہ اور عزت کا احساس کر کے خوش ہوتی تھیں۔ ان کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنے خاندان کی عزت و اہمیت کا شعور بہت گہرا تھا۔ ماں جی کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ہم اکثر پوچھا کرتے کہ کیا ان کی نظر میں کوئی خوش نصیب شخص تھا جو ان کے لیے مناسب شوہر ہو سکتا تھا۔ ماں جی مسکرا کر کانوں پر ہاتھ رکھتیں اور کہتیں کہ ان کے دل میں کسی خاص شخص کے لیے کوئی خواہش نہیں تھی۔ بس اتنی سی خواہش تھی کہ جو بھی ان کے لیے ہو، کم از کم پڑھا لکھا آدمی ضرور ہو۔ یہ خواہش نہ صرف سادہ اور معصوم تھی بلکہ اس میں دنیاوی عیش و عشرت یا بلند مطالبات شامل نہیں تھے۔ ماں جی چاہتی تھیں کہ ان کا شریکِ حیات تعلیم یافتہ اور فہم و فراست والا ہوتا کہ وہ زندگی کے مسائل کو سمجھ سکے اور ایک معقول زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ماں جی کی یہ خواہش ان کی دانائی اور گہری فکر کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ علم کی اہمیت کو سمجھتی تھیں۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ الزمر:9)

ترجمہ: ''فرما دیجیے: کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟''

اسی لیے آنحضور خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے ہر مسلمان کو حصولِ علم کی ترغیب دی ہے۔ آپ کا فرمان ہے:

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔'' (ابنِ ماجہ)

یہ سادہ سی خواہش ماں جی کے دل کی سچائی اور معقول سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کا اصل معیار صرف یہ تھا کہ ان کے شریکِ حیات میں تعلیم اور سمجھ بوجھ ہو اور وہ دل کی سچائی اور سادگی کو سمجھے۔ یہ خواہش اتنی نیک اور صاف تھی کہ اس کا پورا ہونا ایک بڑی خوش قسمتی کی بات تھی۔ خدا نے ماں جی کی اس سادہ خواہش کو پورا کیا اور اسی سال ان کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہوئی۔ عبد اللہ صاحب وہی شخص تھے جو ماں جی کی توقعات کے مطابق تھے۔ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان تھے۔ اس شادی نے ماں جی کی زندگی میں خوشی، سکون اور اطمینان کا آغاز کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انسان سچی نیت سے کوئی جائز خواہش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پوری کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (سورۃ الطلاق:3)

ترجمہ: ''اور جو کوئی اللہ پر توکل (بھروسا) کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔''

عبارت نمبر 8

ان دنوں سارے علاقے میں عبد اللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھے برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ عبد اللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونی ورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونی ورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔ اُڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اُس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبد اللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبد اللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کا خاندان انبالہ سے ہجرت کر کے لائل پور کے نئے آباد کاروں میں شامل ہوا۔ انتہائی غربت اور سخت مشقت کے باوجود ان کی طبیعت میں قناعت اور شکر گزاری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ سرسیّد عبد اللہ صاحب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے، مگر اپنی والدہ کی خاطر انکار پر سرسیّد نے انھیں علی گڑھ سے نکال دیا۔ بعد ازاں عبد اللہ صاحب گلگت کے گورنر بنے اور ماں جی کی شادی ان سے ہوئی۔ ماں جی نے اولاد کی وفات جیسے صدمات صبر سے برداشت کیے۔ عبد اللہ صاحب کی اچانک وفات کے بعد ماں جی نے بچوں کو بھی صبر کی تلقین کی۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی کا خاندان یعنی لائل پور کے مربعہ دار بڑے باعزت اور مالدار سمجھے جاتے تھے۔ نانی جی ماں جی کو ہر روز نت نئے کپڑے پہنا کر دلہن کی طرح سجاتیں تا کہ برادری والے ان کے خاندان کی عزت اور رعب دیکھ سکیں۔ ماں جی خود بھی اپنی خوب صورتی اور وقار پر فخر محسوس کرتی تھیں اور اکثر بتاتی تھیں کہ گاؤں میں لوگ ان کی طرف دیکھ کر کہتے: یہ مربعے دار کی بیٹی ہے، کون خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔ ماں جی کے دل میں شریکِ حیات کے لیے بس ایک سادہ خواہش تھی کہ وہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہو۔ ان کی یہ معصوم خواہش پوری ہوئی اور اسی سال ان کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہوئی۔ یہ واقعہ ماں جی کی زندگی میں خوشی اور سکون کا باعث بنا۔

؎ ملی گل کو خوش بو ، مجھے مل گیا تو — پسند اپنی اپنی ، نصیب اپنا اپنا

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب کی زندگی کا آغاز ایک ایسے گھرانے میں ہوا جو کبھی بہت امیر اور باوقار تھا، لیکن قسمت کے کھیل نے انھیں بچپن میں ہی مشکل حالات میں ڈال دیا۔ وہ پانچ چھ سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے جانے کے بعد حقیقت یہ سامنے آئی کہ گھر کی ساری جائیداد رہن رکھی ہوئی تھی اور مالی حالات انتہائی خراب ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں عبد اللہ صاحب اور ان کی والدہ ایک چھوٹے سے جھونپڑے میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جھونپڑے میں رہتے ہوئے، عبد اللہ صاحب نے پہلی بار زندگی کی سختیوں کو محسوس کیا اور اپنے اندر ایک مضبوط عزم پیدا کیا کہ وہ

مستقبل میں ایسی کامیابی حاصل کریں گے کہ کوئی بھی ان کی دولت پر قبضہ نہ کر سکے۔ حضرت علی کا قول ہے:

''علم دولت سے بہتر ہے کیوں کہ علم تمھاری حفاظت کرتا ہے جب کہ دولت کی حفاظت تمھیں خود کرنی پڑتی ہے۔''

یہ عزم ہی عبد اللہ صاحب کی تعلیم کی لگن کا بنیادی محرک بنا۔ وہ دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ ابتدائی مشکلات نے انھیں ہمت ہارنے کی بجائے اور زیادہ محنت کرنے کا حوصلہ دیا۔ انھوں نے وظیفے حاصل کیے تا کہ تعلیم جاری رکھ سکیں اور کسی قسم کی مالی رکاوٹ ان کے راستے میں نہ آئے۔ وظیفے کے ساتھ ساتھ، انھوں نے دو سال کے امتحانات ایک ایک سال میں پاس کر کے یہ ثابت کیا کہ محنت اور مستقل مزاجی سے انسان ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔ ان کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پنجاب یونی ورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں اول آئے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی، خاص طور پر اُس وقت کے مسلمان طلبا کے لیے، کیوں کہ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان نے یونی ورسٹی کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو۔ عبد اللہ صاحب کی اس مثال نے واضح کر دیا کہ عزم سچا ہو تو اللہ تعالیٰ غریب اور یتیم بچوں کو بھی رفعت اور بلندی عطا کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (سورۃ النجم:39)

ترجمہ: ''اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔''

عبد اللہ صاحب کی یہ کامیابی جلد ہی بڑے تعلیمی اور علمی حلقوں تک پہنچ گئی۔ معروف تعلیمی شخصیت اور اصلاح پسند رہنما سر سید احمد خان، جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کے بانی تھے، نے عبد اللہ صاحب کے بارے میں سنا۔ سر سید نے عبد اللہ صاحب کی ذہانت اور محنت کو اہم سمجھا اور اپنا خاص منشی گاؤں بھیجا تا کہ عبد اللہ صاحب کو علی گڑھ مسلم کالج میں وظیفے پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدعو کیا جا سکے۔ یہ دعوت ایک بڑی عزت کی بات تھی کیوں کہ علی گڑھ مسلم کالج اُس وقت مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا سب سے اہم مرکز تھا۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد عبد اللہ صاحب نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ اپنی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں پیش کیا۔ وہاں انھوں نے اپنی محنت اور ذہانت کا لوہا منوایا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد صرف اُنیس برس کی عمر میں عبد اللہ صاحب کو علی گڑھ میں انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کا لیکچرر مقرر کر دیا گیا۔

؎ سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے (حیدر علی آتش)

عبد اللہ صاحب کے عزم اور حوصلے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشکلات انسان کو کمزور کرنے کے بجائے مضبوط بنا سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ شخص محنت اور عزم کے ساتھ اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ مالی مشکلات، یتیمی اور غربت کے باوجود، عبد اللہ صاحب نے تعلیم کو اپنا ہتھیار بنایا اور اسے اپنی کامیابی کی بنیاد بنایا۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ علم اور محنت کی طاقت کے ذریعے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے اور زندگی میں نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے۔ دراصل صلاحیتوں کی شناخت اور انھیں بروئے کار لانا انسان کی کامیابی کے لیے نہایت اہم ہے۔ سر سید کی طرف سے دعوت ملنے کے بعد عبد اللہ صاحب نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کی بلکہ تدریس کے ذریعے اپنے علم کو دوسروں تک پہنچایا۔ یہ حقیقت ہے کہ علم کی قدر کرنا اور موقع سے فائدہ اٹھانا زندگی میں بڑی کامیابی کا سبب بن سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ استقامت اور محنت کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ عبد اللہ صاحب کی مثال یہ بتاتی ہے کہ چاہے حالات کتنے ہی مشکل ہوں، اگر انسان اپنے مقصد کے لیے محنت کرے تو کامیابی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ علم، محنت و مشقت اور عزم کے ذریعے انسان نہ صرف اپنی زندگی بدل سکتا ہے بلکہ اپنے معاشرے کے لیے بھی ایک مثالی شخصیت بن سکتا ہے۔

مشقت کی ذلت جنھوں نے اُٹھائی جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی

عبارت نمبر 9

سرسید کو اس بات کی دُھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں پر جائیں۔ چناں چہ انھوں نے عبد اللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا تا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبد اللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبد اللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔ اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا دھمکایا لیکن عبد اللہ صاحب ٹس سے مَس نہ ہوئے۔ ''کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟'' سرسید نے کڑک کر پوچھا:

''جی ہاں'' عبد اللہ صاحب نے جواب دیا۔ یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبد اللہ صاحب کو لاتوں، مُکّوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخاست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: ''اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمھارا نام بھی نہ سُن سکوں۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ انبالہ میں جنم لینے والی ماں جی کا خاندان، زمین چھن جانے پر کٹھن حالات میں لائل پور منتقل ہوا۔ غربت کے باوجود ان کا دل سخاوت سے معمور تھا۔ شادی کے لیے ان کی واحد خواہش ایک تعلیم یافتہ جیون ساتھی کی تھی، جسے قدرت نے عبد اللہ صاحب جیسے ذہین اور تعلیم یافتہ انسان سے رشتہ جوڑ کر پورا کیا۔ عبد اللہ صاحب کی علمی کامیابیوں اور ان کے روشن مستقبل نے ماں جی کی زندگی کو ایک نیا وقار اور استحکام بخشا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب ایک کامیاب گورنر تھے، ''ماں جی'' کی شادی ان سے ہوئی۔ یہ رشتہ عمر بھر اسی سادگی اور تقدس کے ساتھ قائم رہا۔ ماں جی بظاہر خود کو خوش نصیب کہتیں، مگر ان کی زندگی اولاد کی وفات اور شوہر کے اچانک انتقال جیسے گہرے صدموں سے عبارت تھی۔ عبد اللہ صاحب کی وفات کے بعد ماں جی نے صبر و استقامت کی مثال قائم کی۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن بچپن میں یتیم اور مالی طور پر مفلس ہو گئے۔ مشکلات کے باوجود انھوں نے تعلیم میں بھرپور محنت کی، وظیفے حاصل کیے اور پنجاب یونی ورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں اول آئے۔ ان کی کامیابی کی خبر سرسید احمد خان تک پہنچی، جنھوں نے انھیں علی گڑھ مسلم کالج میں وظیفے پر تعلیم کے لیے مدعو کیا۔ وہاں عبد اللہ صاحب نے بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں لیکچرر کے طور پر کام شروع کیا۔ ان کی کہانی محنت، لگن اور علم کی قدر کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور یہ سکھاتی ہے کہ مشکلات کے باوجود کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ سرسید احمد خان ایک روشن خیال رہنما تھے جنھوں نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمان نوجوان اعلیٰ سرکاری عہدوں تک پہنچیں تا کہ قوم کی

حالت بہتر ہو اور وہ معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے مضبوط بنیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ تعلیم اور سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری ہیں اور وہ چاہتے تھے کہ نوجوان اپنے وطن کے لیے کام کریں اور عالمی معیار کی کامیابیاں حاصل کریں۔ اس مقصد کے لیے وہ نوجوانوں کو مواقع فراہم کرتے اور ان کی تربیت میں ہر ممکن تعاون کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے عبد اللہ صاحب کو بھی سرکاری وظیفہ دلوانے کی کوشش کی تاکہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شامل ہو سکیں اور اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکیں۔ سرسید کے نزدیک یہ صرف عبد اللہ صاحب کی ذاتی ترقی کا موقع نہیں تھا بلکہ ایک ایسا قدم تھا جس سے مسلمانوں کے معاشرتی اور قومی مفاد کو فائدہ پہنچتا۔ سرسید کی یہ سوچ ان کی دور اندیشی اور جوہر شناسی کی آئینہ دار ہے:

؎ وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے (اقبال)

دوسری طرف عبد اللہ صاحب ایک شریف النفس اور خاندان کے لیے فکر مند نوجوان تھے۔ ان کی والدہ نے اپنے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کیا۔ اس زمانے میں والدین کی رضا اور احترام کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ عبد اللہ صاحب نے اپنی والدہ کی بات کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور وظیفہ واپس کر دیا۔ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا کیوں کہ یہ ان کی ذاتی ترقی کے سنہری موقع سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا، لیکن ان کے دل میں ماں کے لیے محبت اور احترام سب سے مقدم تھا۔ عبد اللہ صاحب نے اپنی ماں کی خواہش کو قوم کے مفاد پر ترجیح دی، اور اسی پر ثابت قدم رہے۔ اسلام میں والدین کی خدمت و اطاعت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے نبی کریم خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ سے جہاد پر جانے کی اجازت چاہی تو آپ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے پوچھا: کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

الزم رجلها فثم الجنة (سنن نسائی)

ترجمہ: ''پس ان کے قدم پکڑے رکھو (ان کی خدمت کرو) کیوں کہ جنت وہیں ہے۔''

دراصل کبھی کبھی فرد کے ذاتی اور خاندانی مفادات اور قومی مفاد کے درمیان کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ سرسید چاہتے تھے کہ عبد اللہ صاحب اعلیٰ عہدہ حاصل کریں تاکہ وہ قوم کی بھلائی میں کردار ادا کر سکیں۔ انھوں نے سمجھایا، ڈرایا دھمکایا اور ہر ممکن کوشش کی کہ عبد اللہ صاحب راضی ہو جائیں۔ سرسید کی نیت نیک تھی اور وہ واقعی چاہتے تھے کہ عبد اللہ صاحب اپنے ملک اور قوم کے لیے اہم مقام حاصل کریں۔

عبد اللہ صاحب نے اپنی ماں کے احترام کو مقدم رکھا اور کہا کہ وہ اپنی والدہ کے حق کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ جواب سن کر سرسید بہت غصے میں آ گئے۔ وہ اس قدر ناراض ہوئے کہ انھوں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے عبد اللہ صاحب پر جسمانی تشدد کیا۔ انھیں لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے مارا گیا، کالج کی نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور علی گڑھ سے نکال دیا گیا۔ سرسید نے انھیں کہا کہ اب وہ ایسی جگہ جائیں جہاں سے ان کا نام بھی نہ سنا جائے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اگر ذاتی یا خاندانی مفاد کو قوم کے مفاد پر ترجیح دی جائے تو قوم کا نقصان ہوگا۔ عبد اللہ صاحب کے نزدیک والدین کی خوشی اور ان کے حقوق سب سے مقدم تھے اور یہ فیصلہ انسانی شرافت، اخلاقیات اور وفاداری کا مظہر تھا۔

؎ نیت ہو اگر نیک تو دیتا ہے خدا بھی کرتے ہیں عمل لوگ تو ملتا ہے صلہ بھی

دراصل انسان کو زندگی میں بعض اوقات سخت فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور ان فیصلوں کے اثرات نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرے پر پڑ سکتے ہیں۔ مقصد چاہے کتنا ہی نیک ہو، اگر اس کے حصول کا طریقہ غلط ہو تو نقصان کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اسی لیے ہر فیصلہ عقل، اخلاق، رشتوں کی قدر اور انسانی جذبات کے توازن پر مبنی ہونا چاہیے۔ ترقی، کامیابی اور عہدے سب اہم ہیں، لیکن انسانی رشتوں، اخلاقی اصولوں اور احترام کی قدر کے بغیر حقیقی کامیابی ممکن نہیں۔ عبد اللہ صاحب کا فیصلہ اس بات کی علامت ہے کہ اصل کامیابی دل کی سچائی، وفاداری اور محبت میں ہے۔

عبارت نمبر 10

عبد اللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے، اتنے ہی سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دُور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چناں چہ وہ ناک کی سیدھ میں گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی، انھی دنوں عبد اللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہوگئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تا کہ عبد اللہ صاحب دُلھن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔ منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلاد دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبد اللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لیے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کیے لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔ اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟ عبد اللہ صاحب نے پوچھا۔ ''اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈال دوں گی۔ ماں جی نے جواب دیا۔ زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آخر میں پنجاب کے گاؤں منیلہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کی زمین نہر کی نذر ہونے پر خاندان لائل پور ہجرت کر گیا، جہاں سب نے انتہائی کسمپرسی میں محنت مزدوری کی۔ ماں جی کی زندگی ایثار اور صبر کا عملی نمونہ تھی۔ ان کی شادی تعلیم یافتہ عبد اللہ صاحب سے ہوئی، جنھوں نے اپنی والدہ کی خاطر ولایت جانے کا سرکاری وظیفہ ٹھکرا دیا، جس پر سرسید احمد خان ناراض ہو گئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ بظاہر خوش نصیب نظر آنے والی ماں جی کی زندگی دراصل صدمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھی۔ مگر انھوں نے ہمیشہ ضبطِ نفس کا مظاہرہ کیا۔ ان کی وفات کے بعد اولاد ایک دائمی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ماں جی کی سادہ زندگی اور قناعت پسندی کے برعکس، معاشرتی رسم و رواج اور عقیدت کے تقاضے انھیں تذبذب کا شکار رکھتے ہیں۔ کبھی ماں جی کو یاد کر کے رونے پر ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ ہو اور کبھی ضبطِ غم ممکن نہیں رہتا۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ سرسید چاہتے تھے کہ عبد اللہ صاحب اعلیٰ سرکاری عہدہ حاصل کریں تا کہ مسلمانوں کی ترقی میں حصہ ڈال سکیں اور قوم مضبوط بنے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے عبد اللہ صاحب کو انگلستان جانے کے لیے وظیفہ دلوانے کی کوشش کی تا کہ وہ آئی سی ایس کے امتحان میں شامل ہو سکیں۔ لیکن عبد اللہ صاحب نے اپنی والدہ کی خواہش کو مقدم رکھا اور وظیفہ واپس کر دیا۔ اس پر سرسید شدید غصے میں آ گئے، انھیں جسمانی سزا دی، کالج کی نوکری سے برطرف کیا اور علی گڑھ سے نکال دیا۔ عبد اللہ صاحب نے سب کچھ اللہ کی رضا اور والدہ کی خواہش کے مطابق کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کا اجر ضرور دے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجرَ الْمُحسِنِينَ (سورۃ التوبہ:120)

ترجمہ: ''بے شک اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب ایک خوش قسمت اور قابل شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف اپنے والدین کے سعادت منداور فرماں بردار بیٹے تھے بلکہ شاگرد بھی اتنے ہی فرماں بردار اور سعادت مند تھے۔ عبد اللہ صاحب کی زندگی اس بات کی عکاس تھی کہ محنت، لگن اور درست فیصلوں سے انسان اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے، چاہے منزل کتنی ہی مشکل یا دور کیوں نہ ہو۔ ان کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سب سے دور اور دشوار گزار علاقے گلگت کو اپنی منزل بنایا اور وہاں نہ صرف پہنچے بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کے اعلیٰ عہدے، یعنی گورنری کے عہدے، پر فائز ہو گئے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ عبد اللہ صاحب کی صلاحیتیں اور عزم کسی بھی مشکل کو آسان بنانے کے لیے کافی تھے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے اور ہر مقام پر کامیابی حاصل کرتے تھے۔

اسی دوران میں ماں جی کی زندگی میں ایک اہم مرحلہ آیا۔ ان کی منگنی ہونے والی تھی اور وہ اس بارے میں فکر مند تھیں کہ ان کی زندگی میں یہ نیا رشتہ کس طرح قائم ہوگا۔ قسمت کی بات یہ تھی کہ اسی وقت عبد اللہ صاحب بھی گاؤں میں چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ یہ اتفاق یا تقدیر کی ترتیب دونوں کے لیے خوش آئند ثابت ہوئی۔ دونوں کی منگنی ہوگئی اور ایک ماہ بعد شادی کا دن بھی طے پا گیا۔

منگنی کے بعد ایک دن ماں جی اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ میلا دیکھنے پاس والے گاؤں گئیں۔ اس میلے میں اتفاقاً عبد اللہ صاحب بھی پہنچ گئے۔ ان کی موجودگی نے ماحول کو خوش گوار اور دل چسپ بنا دیا۔ ماں جی کی سہیلیوں نے عبد اللہ صاحب کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا اور انھیں گھیر لیا۔ ہر ایک نے عبد اللہ صاحب سے پانچ پانچ روپے وصول کیے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی کئی روپے پیش کیے، لیکن ماں جی نے انکار کر دیا۔ یہ انکار دراصل ماں جی کی سادگی، عاجزی اور خودداری کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ مالی فائدہ یا رقم حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والی شخصیت نہیں تھیں۔ عبد اللہ صاحب کے اصرار کے بعد بھی ماں جی نے صرف گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔ عبد اللہ صاحب حیران ہوئے اور پوچھا کہ اتنے معمولی سے پیسوں کا کیا فائدہ؟ ماں جی نے جواب دیا کہ اگلی جمعرات کو مسجد میں ان کے نام سے تیل ڈال دوں گی۔ اس چھوٹے سے واقعے نے نہ صرف محفل کو دل چسپ بنایا بلکہ ماں جی کی سادگی اور نیک نیتی کو بھی اجاگر کیا۔ آنحضور خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کا ارشادِ گرامی ہے:

لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ (صحیح بخاری)

ترجمہ: ''امیری مال کی کثرت کا نام نہیں بلکہ اصل امیری تو دل کا غنی ہونا ہے۔''

اکثر لوگ اپنے رشتوں میں مالی یا مادی لین دین کو اہمیت دیتے ہیں، لیکن ماں جی اور عبد اللہ صاحب کی کہانی اس بات کی مثال ہے کہ تعلقات کی اصل قیمت محبت، عزت، اعتماد اور سادگی میں چھپی ہوتی ہے۔ ماں جی نے نہ کبھی عبد اللہ صاحب سے زیادہ رقم طلب کی، نہ اپنے پاس رکھی اور نہ ہی زندگی کے کسی دوسرے مرحلے پر وہ مالی خواہشات میں مبتلا ہوئیں۔ ان کا رویہ سادگی اور خودداری کی بہترین مثال تھا۔

؎ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

عبد اللہ صاحب بھی نہ صرف کامیاب اور خوش قسمت انسان تھے بلکہ ان کی عاجزی، نیک نیتی اور خلوص بھی قابلِ تعریف تھے۔ وہ اپنی کامیابی کے باوجود تعلقات میں محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ماں جی اور عبد اللہ صاحب کے درمیان یہ معمولی سا لین دین بھی ایک محبت بھرا اور یادگار لمحہ بن گیا، جو دونوں کے تعلقات کی سادگی اور خلوص کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل زندگی میں بعض اوقات سب سے بڑی خوشیاں اور قیمتی لمحات چھوٹی چھوٹی چیزوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ گیارہ پیسے کا یہ واقعہ، جو بظاہر معمولی اور کم اہم لگتا ہے، دراصل ماں جی اور عبد اللہ صاحب کے تعلقات کے معیار، ان کے اعتماد اور محبت کی علامت بن گیا۔

؎ وہ جو اک ربطِ محبت ہے مٹانا اس کا میری طاقت میں نہیں آپ کی قدرت میں نہیں

مختصر یہ کہ عبد اللہ صاحب اور ماں جی کے تعلقات کی بنیاد محبت، احترام، اعتماد اور سادگی پر تھی۔ زندگی کے طویل اور

مختصر لمحات میں حقیقی خوشی انھی چیزوں میں چھپی ہوتی ہے جو دل سے نکلیں اور دل تک پہنچیں۔ دراصل تعلقات میں مادیت کی بجائے محبت، عزت، اعتماد اور سادگی کو اہمیت دینی چاہیے، کیوں کہ یہی چیزیں زندگی کو خوب صورت اور یادگار بناتی ہیں۔

عبارت نمبر 11

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سُوجھتا۔ ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔ اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالمِ شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔ کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ ''اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا'' لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو روپا نہ کرتی ہوں گی!

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ایک درویش صفت اور قناعت پسند خاتون تھیں۔ ہجرت کی مشکلات اور انتہائی غربت میں بھی انھوں نے شکر گزاری کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کی واحد خواہش ایک تعلیم یافتہ جیون ساتھی کی تھی، جو عبد اللہ صاحب سے شادی کی صورت میں پوری ہوئی۔ ان کی زندگی کا مرکز سادگی، اللہ کی رضا اور مخلوقِ خدا کی خدمت تھا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب اپنی اہلیہ (ماں جی) کے ساتھ ایک خوش گوار لمحے کے دوران میں گنا کھاتے ہوئے اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماں جی نے صبر و استقامت کی مثال قائم کرتے ہوئے بچوں کو صبر کی تلقین کی اور اپنے شوہر کی پُرسکون موت پر رونے سے منع کیا تاکہ ان کی روح کو تکلیف نہ ہو۔ تاہم ماں جی کے انتقال کے بعد ان کے بچے ایک عجیب مخمصے کا شکار ہیں۔ ایک طرف ان کی عقیدت اور محبت ہے جو محدود وسائل میں ان کے نام پر ایصالِ ثواب کرنا چاہتی ہے، دوسری طرف معاشرتی دباؤ اور رسومات کی ہیں۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کے بارے میں اکثر کہا جاتا تھا کہ وہ بہت خوش نصیب ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بچوں کی نعمت سے نوازا۔ ان کے گھر میں تین بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ عام طور پر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جس ماں کے اتنے بچے ہوں تو وہ دنیا کی سب سے خوش نصیب ماں ہے۔

؎ چوٹ اپنے بچوں کی مائیں دل پہ کھاتی ہیں بچے مسکرائیں تو مائیں مسکراتی ہیں

خود ماں جی بھی اکثر یہ کہتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں کم ہی پیدا ہوئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم صرف خوش نصیبی کے مطلب کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ماں جی کی زندگی ہمیشہ خوشیوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن اگر ہم گہرائی میں جائیں اور ماں جی کے دل و دماغ کی کیفیت کو سمجھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر بہت دکھ، صدمے اور غم بھی چھپے ہوئے تھے۔

؎ لاکھوں غم چھپائے ہیں اک خوشی کے پردے میں درد ہی کے سائے ہیں ہر ہنسی کے پردے میں

ماں جی نے اپنے بچوں کی پرورش میں اپنی تمام محبت اور محنت لگا دی۔ وہ ان کے ہر دکھ درد اور ہر خوشی میں شریک رہتی

تھیں۔ان کی زندگی میں بچوں کی تربیت، ان کی تعلیم، ان کے اخلاق اور ان کی ضروریات پوری کرنا سب سے اہم کام تھا۔ مگر زندگی کی ستم ظریفی یہ تھی کہ ان کی دو بیٹیاں، جوان کے دل کے بہت قریب تھیں، شادی کے کچھ عرصے بعد اچانک وفات پا گئیں۔ یہ صدمہ ماں جی کے لیے ناقابل بیان تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو تسلیم کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ اللہ کا فیصلہ تھا، اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ مگر حقیقت میں یہ صدمے ان کے دل پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ اولاد کی وفات ماں جی کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا لیکن انھوں نے ہمیشہ صبر واستقامت سے کام لیا۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایسے لوگوں کے لیے ارشادِ مبارک ہے:

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (سورۃ البقرہ:156)

ترجمہ: ”اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے جنھیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

ماں جی کے سب سے بڑے بیٹے نے اپنی جوانی کی بہترین عمر میں انگلستان کا سفر کیا اور وہاں اچانک وفات پا گئے۔ یہ حادثہ ماں جی کے لیے ایک اور بھاری صدمہ تھا۔ اگرچہ ماں جی کہتی تھیں کہ اللہ کا مال تھا اور اللہ نے لے لیا، مگر حقیقت میں وہ چھپ کر اپنی آنکھوں سے خون کے آنسو بہاتی تھیں۔ ہر ماں کے لیے اپنے بچے کا انتقال سب سے بڑا صدمہ ہوتا ہے اور ماں جی نے اس دکھ کو صبر اور تحمل سے جھیلا، مگر اس کے اثرات ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ رہ گئے۔

؎ زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتا ہے دوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

ماں جی کی زندگی میں دکھ صرف بچوں کی وفات تک محدود نہیں تھے۔ ان کے ہر بیٹے اور بیٹی کی زندگی میں کبھی نہ کبھی مشکلات اور پریشانیاں آئیں اور ماں جی نے ہر حالت میں ان کے ساتھ رہ کر انھیں سہارا دیا۔ ان کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا آسان نہیں تھا، مگر انھوں نے کبھی اپنے دکھوں کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان کے رویے میں جو صبر اور حوصلہ نظر آتا تھا، وہ حقیقت میں ایک مضبوط چھتری کی طرح تھا جس نے ان کے دکھوں کو اندر ہی اندر سنبھال رکھا تھا۔

؎ مری قسمت تھی میں نے دھوپ پائی ہے وراثت میں مری خواہش ہے میں بچوں کو اپنے پیڑ دے جاؤں

ماں جی کی خوش نصیبی کا مطلب صرف یہ نہیں تھا کہ انھیں بچے ملے، بلکہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صبر اور حوصلے کی طاقت دی تاکہ وہ ان صدمات کے باوجود اپنے خاندان کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ان کی زندگی ایک ایسی مثال ہے جس میں خوش نصیبی اور دکھ دونوں ایک ساتھ موجود تھے۔ ظاہری طور پر تو سب کچھ اچھا لگتا تھا، مگر اندر کی دنیا میں وہ درد اور صدمے چھپے ہوئے تھے جنھیں صرف ماں جی ہی محسوس کر سکتی تھیں۔

؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں (غالبؔ)

ماں جی کا دل ہمیشہ بچوں کی محبت سے بھرا رہا، ماں جی کی زندگی کا یہ پہلو ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ماں کی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ماں جی کی زندگی میں دکھ اور صدمے کے ساتھ ساتھ صبر اور حوصلہ بھی تھا۔ انھوں نے ہر صدمے کے بعد اپنے دل کو مضبوط رکھا اور اپنے بچوں کی پرورش جاری رکھی۔ ان کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دکھ اور مشکلات کے باوجود بھی انسان اپنی ذمہ داریوں اور محبت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ماں جی کی خوش نصیبی صرف اولاد کے ہونے میں نہیں تھی، بلکہ اس میں بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صبر اور تحمل کی طاقت دی تھی تاکہ وہ ان صدمات کے باوجود زندگی کو جاری رکھ سکیں۔ یہ صبر اور تحمل ہی حقیقی خوش نصیبی تھی۔ بظاہر وہ خوش نصیب تھیں کیوں کہ ان کے پاس بچے تھے، لیکن ان کی زندگی کے اندر جو دکھ اور صدمے چھپے ہوئے تھے، وہ یہ بتاتے تھے کہ حقیقی خوش نصیبی صرف نعمتوں میں نہیں بلکہ ان نعمتوں کو صبر اور حوصلے کے ساتھ سنبھالنے میں بھی ہے۔

عبارت نمبر 12

جب عبد اللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبد اللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسبِ معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے: ''بھاگوان! شادی سے پہلے میلے میں مَیں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟'' ماں جی نے نئی دُلھنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبد اللہ صاحب گنے کی قاش مُنھ میں لیے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبد اللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ کسمپرسی میں ہجرت کرنے والی ماں جی نے انتہائی سادگی اور دوسروں کی خدمت میں عمر گزاری۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ شوہر سے بھی صرف مسجد کے چراغ کے لیے گیارہ پیسے لیتی تھیں۔ اولاد کی وفات اور شوہر کی اچانک جدائی جیسے بڑے صدمات سہنے کے باوجود وہ ہمیشہ اللہ کا مال کہہ کر صبر کرتی رہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی نے رخصت ہوتے وقت صبر کی تلقین کی تھی تاکہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے، مگر ان کے بعد بچے ایک ذہنی الجھن کا شکار ہیں۔ ایک طرف اولاد کی عقیدت ہے جو ایصالِ ثواب کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے مگر معاشی تنگی آڑے آتی ہے۔ دوسری طرف معاشرتی دباؤ اور مذہبی رسومات کے نام پر پُرتکلف ضیافتوں کا تقاضا گھٹن میں مبتلا کرتا ہے۔ یوں غم کا اظہار اور ضبط دونوں ہی مشکل ہو گئے ہیں۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی کی زندگی میں خوش نصیبی اور دکھ دونوں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کیے، جس کی وجہ سے وہ بظاہر دنیا کی خوش نصیب ماں نظر آتی تھیں اور خود بھی اکثر یہ کہتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں کم ہی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن زندگی نے انھیں کئی صدمات بھی دیے۔ ان کی دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد اچانک وفات پا گئیں اور سب سے بڑا بیٹا جوانی کی عمر میں انگلستان جا کر چل بسا۔ وہ اللہ کی رضا قبول کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ اللہ کا مال تھا لیکن تنہائی میں وہ چھپ کر اپنے دکھ اور صدمے سہتی تھیں۔ ماں جی نے ہر صدمے کے باوجود صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے باقی بچوں کی پرورش جاری رکھی۔ وہ ان کے ہر دُکھ، خوشی اور مشکلات میں شریک رہتی تھیں اور اپنے دکھ کو کبھی دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان کی زندگی یہ سکھاتی ہے کہ حقیقی خوش نصیبی صرف اولاد یا نعمتوں کے ہونے میں نہیں بلکہ صبر، تحمل، محبت اور رضا کے ساتھ ان نعمتوں کو حوصلے سے سنبھالنے میں ہے۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنے والوں کو جب کسی صدمے کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ صبر و اطاعت کا پیکر بن جاتے ہیں۔ وہ شکوہ نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں:

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

ترجمہ: ''وہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ عبد اللہ صاحب اس وقت باسٹھ سال کے قریب تھے اور ماں جی پچپن سال کی تھیں۔ سہ پہر کا وقت تھا، یعنی دن کا وہ لمحہ جب روشنی تھوڑی سی مدھم اور ماحول پرسکون ہوتا ہے۔ عبد اللہ صاحب ایک کھردری بان کی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ یہ منظر عام زندگی کی سادگی اور روایتی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ چارپائی کا استعمال دیہی اور پرانے انداز کی زندگی کی طرف اشارہ ہے، جہاں لوگوں کی زندگی سادہ اور فطرت کے قریب ہوتی ہے۔ نیم دراز ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ آرام اور سکون محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اس حالت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماں جی کے ساتھ اپنے معمول کے پل گزار رہے تھے، جو ان کی زندگی کے روزمرہ کے خوشی کے لمحات تھے۔

ہمارا گھر ہے حسین گلشن، خوشی کی کلیاں کھلی ہوئی ہیں — وفا کی خوش بو بسی ہوئی ہے، ہوئی نہ ہوگی یہاں لڑائی

(عبدالقادر)

ماں جی ان کے قریب بیٹھی گنے کے چھلکے اُتار رہی تھیں۔ یہ عمل محبت، خدمت اور توجہ کی علامت ہے۔ گنا چھیلنے اور کھلانے کا عمل صرف کھانے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ رشتوں میں قربت، محبت اور خلوص کی علامت بھی ہوتا ہے۔ ماں جی کی حالت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور محبت عبد اللہ صاحب پر مرکوز کر رہی تھیں۔ عبد اللہ صاحب پہلے مذاق کر رہے تھے اور مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے، لیکن اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ عبد اللہ صاحب کا کہنا، ''بھاگوان! شادی سے پہلے میلے میں، میں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟'' یہ ایک لطیف مزاج کا اظہار تھا۔ وہ ماضی کی یادوں کو تازہ کر رہے تھے اور ماں جی کے ساتھ اپنے رشتے کی گہرائی کو محسوس کر رہے تھے۔

یہ بات بات میں کیا نازکی نکلتی ہے — دبی دبی ترے لب سے ہنسی نکلتی ہے (داغ دہلوی)

ماں جی نے اس لمحے سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مشغول ہو گئیں۔ یہ ردِعمل نرم مزاجی، عاجزی اور محبت کی عکاسی تھا۔ ان کے دل میں کئی خیال اُبھر آتے ہیں۔ وہ یاد کرتی ہیں کہ شادی سے پہلے کے وہ معمولی واقعات کتنے قیمتی اور اہم تھے۔ پھر شادی کے بعد عبد اللہ صاحب کے ساتھ گزارے لمحات، محبت بھری دیکھ بھال اور قربت کی یادیں آتی ہیں۔ ماں جی کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللہ صاحب نے ہر ممکن محبت اور احترام سے نوازا، یہ اس لائق ہیں کہ ان کے پاؤں دھو کر پیے جائیں یا اپنی کھال کی جوتیاں ان کو پہنائی جائیں۔ یہ سوچ ان کے دل میں عاجزی اور مکمل محبت کی علامت ہے۔ لیکن قسمت اور وقت کے کھیل میں، جو چیز انسان کے قابو میں نہیں، وہ آخر سامنے آجاتی ہے۔ عبد اللہ صاحب اچانک مکمل نیند میں چلے جاتے ہیں۔ ماں جی بہت کوشش کرتی ہیں، انھیں ہلاتی، چمکارتی ہیں، لیکن عبد اللہ صاحب ایسی نیند میں ہوتے ہیں کہ بیداری ممکن نہیں۔ موت کا وقت مقرر ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آلِ عمران: 145)

ترجمہ: ''اور کسی جان دار کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ (موت کا) ایک وقت لکھ کر مقرر کیا ہوا ہے۔''

یہ منظر نہ صرف انسانی تعلقات کی نزاکت اور محبت کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ زندگی اور موت کی حقیقت بھی سامنے لاتا ہے۔ ماں جی کے لیے یہ لمحہ غم اور صدمے کا ہے، کیوں کہ وہ اپنے محبوب شوہر کے اچانک جانے کا احساس کر رہی ہیں اور وہ یہ جانتی ہیں کہ اب ان کے پاس صرف یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ عبد اللہ صاحب کی مزاح اور محبت بھری باتیں اور ماں جی کی عاجزی، خدمت اور محبت، یہ سب انسانی تعلقات کی خوب صورتی کو بیان کرتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے خوش گوار لمحات، روزمرہ کے معمولات، اور رشتوں میں محبت کی چھوٹی چھوٹی کاوشیں بہت اہم ہوتی ہیں۔ یہ لمحے زندگی کے سب سے قیمتی اور یادگار لمحات ہوتے ہیں، جو موت کے بعد بھی دل میں زندہ رہتے ہیں۔

ویراں ہے مے کدہ غم و ساغر اداس ہیں — تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

مختصر یہ کہ اس واقعہ میں محبت، خلوص، انسانی جذبات اور زندگی کی ناپائیداری کی مکمل تصویر موجود ہے۔ چناں چہ زندگی میں محبت اور تعلقات کو سنبھالنا اور ہر لمحے کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے، عبد اللہ صاحب کی مزاح اور محبت اور ماں جی کی خدمت اور خیال، یہ سب انسانی رشتوں کی قربت کو سامنے لاتے ہیں۔

عبارت نمبر 13

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی: ''بچہ! رونا مت۔ تمھارے ابّا جی جس آرام سے سو رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔'' جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انھیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔ اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی، لیکن مسجد کا مُلّا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہوگئی ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ غربت کے ماحول میں پلنے والی ماں جی کو ہمیشہ اللہ پر کامل توکل تھا۔ ان کی شادی ایک انتہائی ذہین اور تعلیم یافتہ شخص عبد اللہ صاحب سے ہوئی۔ ماں جی کی زندگی بندگی اور صبر کا عملی نمونہ تھی۔ اولاد اور شوہر کی وفات جیسے گہرے صدمات کے باوجود وہ اللہ کی رضا پر راضی رہیں۔ ان کی سادگی، درویشی اور دوسروں کی حاجت روائی نے انھیں ایک مثالی شخصیت بنایا جو زندگی بھر اپنی سچی بندگی نبھاتی رہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ ماں جی کی یاد دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے؛ آنکھیں برسنا چاہتی ہیں مگر ماں کی روح کو تکلیف پہنچنے کے خوف سے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف فاتحہ کے لیے مکئی کی روٹی اور چٹنی کا سادہ انتخاب کسی کو ناگوار گزرتا ہے جو پلاؤ اور زردے کی شرط عائد کر دیتا ہے۔ یہ بے بسی اور دکھ کا ایک ایسا امتزاج ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ سہ پہر کا وقت تھا، جب عبد اللہ صاحب نیم دراز چارپائی پر گنا چوس رہے تھے اور خوش مزاجی کے ساتھ مذاق کر رہے تھے۔ ماں جی ان کے قریب بیٹھی گنا چھیل چھیل کر دے رہی تھیں، جس سے ان کے خلوص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اچانک عبد اللہ صاحب سنجیدہ ہو گئے اور ماضی کے لمحات یاد کرتے ہوئے پوچھا کہ شادی سے پہلے دیے گئے گیارہ پیسے واپس کرنے کا وقت آیا یا نہیں۔ ماں جی دل ہی دل میں یادوں اور محبت کے احساسات میں ڈوب گئیں۔ لیکن قضا و قدر کا وقت آ گیا اور عبد اللہ صاحب اچانک گہری نیند میں چلے گئے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے ۔ آج وہ کل ہماری باری ہے

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی ایک ایسی ماں اور بیوی تھیں جو زندگی کے کئی تجربات اور دکھ سہ چکی تھیں۔ ان کی سوچ اور رویہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی تربیت کی فکر کرتیں بلکہ اپنی محبت اور جذبات کو بھی بہت گہرائی سے محسوس کرتی تھیں۔ ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگایا اور انھیں نصیحت کی کہ وہ اپنے والد کے جانے پر زیادہ نہ روئیں۔ وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ والد جس سکون کے ساتھ سو رہے تھے، اسی سکون کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو

گئے۔اس سے ماں جی نے بچوں کو یہ پیغام دیا کہ رونے اور غم کرنے سے والد کی روح کو تکلیف پہنچے گی اور اسی طرح انھیں زندگی میں صبر اور تحمل اختیار کرنے کا درس بھی دیتی تھیں۔

؎ وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے (ریاض مجید)

دوسری طرف ماں جی خود بھی جذبات رکھتی تھیں۔شوہر کی یاد میں شاید انھوں نے چپکے سے بہت دکھ محسوس کیا ہوگا۔باسٹھ سال کی عمر تک شوہر نے انھیں ایک جوان اور دل کش دُلہن کی طرح سمجھا۔اس سے ماں جی کی وفاداری اور محبت کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ نہ صرف اپنی زندگی کے فیصلوں میں مضبوط اور مستقل مزاج تھیں بلکہ اپنے شوہر کی محبت اور وفاداری کی قدر کرنے والی بھی تھیں۔

ماں جی دنیا سے جانے کے بعد، بچوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں۔یہ سوالیہ نشان بچوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔انھیں ہمیشہ والدہ کے کردار، محبت اور ان کے پیغام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرے گا۔بچوں کے لیے ماں جی کی زندگی اور ان کے افعال ایک سبق کی طرح تھے، یہ سوالیہ نشان شاید ان کی وفاداری، اخلاقی اصولوں اور زندگی کے تجربات کے بارے میں بچوں کے ذہن میں ہمیشہ ایک علامت کے طور پر رہے گا۔

ماں جی کی عاجزی اور سادگی بھی اس عبارت میں نمایاں ہے۔ان کے نام پر اگر کوئی خیرات دی جائے تو وہ معمولی سی ہوسکتی ہے اور گیارہ پیسے سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔یہ بات ان کی عاجزی اور سادگی کی عکاس ہے۔وہ اپنی زندگی میں نہ تو کسی سے زیادہ مانگتیں اور نہ ہی دکھاوا کرتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ انسان کو دنیاوی چیزوں کی بجائے اپنے دل کے سکون اور اللہ کی رضا کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ان کی سادگی اور عاجزی بچوں کے لیے بھی ایک سبق تھی کہ زندگی میں دکھاوے اور مال و دولت کی اہمیت کم ہوتی ہے اور اخلاقی اصول اور محبت زیادہ قیمتی ہیں۔آں حضور خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ کا ارشادِ مبارک ہے:

لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ (صحیح بخاری)

ترجمہ: ''امارت (امیری) مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقی امیر تو دل کا غنی (اور قناعت پسند) ہونا ہے۔''

اس عبارت میں روزمرہ کے مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں، جیسے مسجد کے ملا کی فکر بجلی اور تیل کی قیمتوں کے بارے میں۔ یہ حقیقت زندگی کی مشکلات اور مالی مسائل کو واضح کرتی ہے۔زندگی میں ہر شخص کو اپنے ظرف کے مطابق مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ماں جی اور ملا دونوں اپنے اپنے انداز میں زندگی کے حقائق سے واقف تھے۔ماں جی بچوں کی اخلاقی تربیت کی فکر میں مصروف تھیں، جب کہ ملا روزمرہ کے مالی اور معاشرتی مسائل کی فکر میں تھے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی میں جذبات، اخلاقی اصول، اور معاشرتی و مالی مسائل سب ایک ساتھ چلتے ہیں اور ہر فرد کو اپنی ذمہ داری کے مطابق ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

؎ ان گنت خونی مسائل کی ہوا ایسی چلی رنج و غم کی گرد میں لپٹا ہر اک چہرہ ملا

ماں جی اپنے بچوں کو یہ بھی سکھاتی تھیں کہ دکھ اور غم کا سامنا صبر اور حوصلے کے ساتھ کرنا چاہیے۔وہ خود جذباتی اور حساس تھیں، مگر بچوں کے لیے مضبوط رہتی تھیں۔ان کی زندگی میں محبت، وفاداری، عاجزی، اور کردار کی مضبوطی کے پہلو نمایاں تھے۔ماں جی کی نصیحت بچوں کے لیے ایک اخلاقی سبق ہے کہ زندگی میں مصیبت اور دکھ آسکتے ہیں، مگر ان کا مقابلہ صبر، تحمل اور مثبت رویے سے کرنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ ماں جی نے اپنے بچوں کے لیے ایک مثال قائم کی کہ جذبات کو محسوس کرنا اور ساتھ ہی ذمہ داریوں کو نبھانا ضروری ہے۔ان کی زندگی میں محبت، وفاداری، اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت سب کے لیے واضح تھی۔بچوں کے لیے یہ تجربات مشعلِ راہ تھے جو انھیں زندگی میں درست فیصلے کرنے اور اخلاقی اصولوں پر قائم رہنے کی ترغیب دیتے تھے۔

عبارت نمبر 14

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ

فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔ ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ انتہائی صابر اور قناعت پسند خاتون تھیں، جن کی شخصیت غربت، ہجرت اور سخت مشقت کی بھٹی میں تپ کر کندن بنی۔ لائل پور کی آبادکاری کے مشکل دور میں، انھوں نے نہ صرف بھوک اور مشقت کا سامنا کیا بلکہ اپنی خودداری کو ہمیشہ قائم رکھا۔ ان کی زندگی کی واحد خواہش ایک تعلیم یافتہ جیون ساتھی کا حصول تھا جو عبد اللہ صاحب سے شادی ہونے پر پوری ہوئی۔ ان کا ہر عمل اللہ کی رضا کا مظہر تھا۔ اولاد کی وفات ہو یا شوہر کی اچانک جدائی، انھوں نے کبھی شکوہ نہیں کیا اور اپنے بچوں کو ہمیشہ اللہ کا مال سمجھا۔ ان کے پاس دنیوی اسباب انتہائی قلیل تھے مگر ان کا دل دولتِ ایمان سے مالا مال تھا۔ مسجد کے چراغ کے لیے گیارہ پیسے کی مستقل نیکی، ان کی بے لوث محبت اور خدا پر کامل بھروسے کی علامت تھی۔ وہ تسلیم و رضا کی عملی تصویر تھیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے اس لیے اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک منفرد اور معتبر نثر نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادگی، اثر آفرینی اور مشاہدے کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ تشریح طلب عبارت ان کے افسانے ''ماں جی'' سے لی گئی ہے۔ ان کا یہ افسانہ ایک جذباتی اور انتہائی سادہ مگر دل کو چھو لینے والا خاکہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ماں کی محبت، شفقت اور عظمت کو بہت دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بچوں کو تسلی دیتے ہوئے نصیحت کی کہ وہ اپنے والد کی موت پر زیادہ نہ روئیں، کیوں کہ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ وہ اپنے دکھ کو چھپا کر بچوں کے لیے حوصلے کا مظاہرہ کرتیں، حالاں کہ خود دل ہی دل میں اپنے شوہر کی جدائی پر غمگین تھیں۔ ان کے شوہر آخری عمر تک ان سے محبت کرتے رہے اور کبھی کسی دوسری عورت کو ان پر ترجیح نہیں دی۔ ماں جی کے انتقال کے بعد ان کی سادہ اور وفادار زندگی بچوں کے دلوں میں ایک سوال چھوڑ گئی، جو ہمیشہ ان کے لیے عقیدت اور یاد کا سبب بنے گا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ اس جملے میں محض کھانے کی چیزوں کا ذکر نہیں بلکہ ماں کی پوری شخصیت اور زندگی کا انداز نظر آتا ہے۔ مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سادہ زندگی کی علامت ہیں۔ یہ سادہ کھانے دراصل قناعت، خلوص اور بے ساختگی کی پہچان ہیں۔ ماں جی کی زندگی بھی انھی صفات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ دکھاوے سے دور، فضول خرچی سے بیزار اور سادہ زندگی گزارنے والی خاتون تھیں۔ ان کے نزدیک محبت اور خلوص کا اظہار کسی مہنگی چیز سے نہیں بلکہ دل کی نرمی اور خالص جذبے سے ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے نام پر فاتحہ دی جائے، تو ان کی یاد میں وہی کھانا تیار کرنے کو دل چاہتا ہے جو وہ خود پسند کرتی تھیں، گویا اس عمل کے ذریعے وہ ماں کی سادگی کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

؎ تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں　　کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

مصنف مزید کہتے ہیں کہ ''کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔'' یہ جملہ ایک سماجی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ درویش یہاں اس ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے جو عبادات اور رسومات کو ظاہری دکھاوے سے جوڑ دیتی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہبی یا روحانی کام تب ہی مکمل ہوتے ہیں جب ان میں اہتمام، کثرت اور نمود و نمائش ہو۔ لیکن ماں جی کی زندگی کے برعکس یہ سوچ خلوص سے خالی ہے۔ ماں جی کے نزدیک عبادت اور نیکی کی اصل روح سادگی میں تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ نیکی دل کے ارادے اور نیت سے ہوتی ہے، نہ کہ فضول خرچی سے۔ درویش کی بات اس سوچ کی عکاس ہے جس میں

مذہب کو رسم و رواج کا تابع بنا دیا گیا ہے، جب کہ مصنف کے دل میں ماں کی یاد کی اصل روح وہی ہے جو سادگی اور اخلاص میں ہے۔

؎ شیخ صاحب نے مسائل میں جکڑ رکھا ہے ورنہ اسلام تو آسان تھا اچھا خاصا

یہاں ایک تضاد سامنے آتا ہے، ایک طرف دنیاوی دکھاوا اور رسم پرستی ہے اور دوسری طرف ماں جی کی سادہ، بے ریا زندگی۔ درویش کے لیے شاید پلاؤ اور زردہ ثواب بڑھانے کا ذریعہ ہوں، مگر مصنف کے لیے مکئی کی روٹی اور چٹنی ہی ماں کے خلوص کی پہچان ہیں۔ یہی تضاد دراصل مصنف کے دل کی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے، وہ دنیا کے رسم و رواج سے دور ہیں، وہ ماں کی محبت کو سچائی اور دل کی گہرائی سے محسوس کرتے ہیں۔ ماں کی یاد ایک ایسی شے ہے جو وقت کے ساتھ مٹتی نہیں بلکہ اور گہری ہو جاتی ہے۔ ماں کا نام آتے ہی وہ تمام لمحات، وہ تمام باتیں، وہ دعائیں اور وہ چہرہ یاد آ جاتا ہے جو زندگی میں سکون کی علامت تھا۔ ماں کے ساتھ انسان کا رشتہ دنیا کا سب سے مضبوط اور خالص رشتہ ہے۔ ماں کے جانے کے بعد زندگی میں کتنی ہی کامیابیاں کیوں نہ مل جائیں، ایک کمی ہمیشہ رہتی ہے۔ یہی احساس مصنف کے دل میں موجود ہے۔

وہ جب ماں کا نام سنتا ہے تو دل بھر آتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کیوں کہ ماں کی محبت اور قربانیوں کا تصور بھی انسان کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کے دل میں ماں کی یاد ایک مسلسل جذباتی کیفیت بن گئی ہے۔ وہ رونا چاہتا ہے، دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، مگر ایک اندرونی خوف اسے روک لیتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ان کی روح کو بھی کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ رونا یا غم منانا شاید ماں جی کی روح کے لیے باعثِ اذیت ہو۔ یہ سوچ محبت کی انتہا ہے۔ وہ اپنے دکھ کو اپنے اندر رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ ماں کی روح کو سکون ملے۔

؎ ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

لیکن مصنف کا دل ضبط نہیں کر پاتا۔ چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی مضبوط ظاہر کرے، ماں کی یاد پر ضبط کرنا ممکن نہیں۔ یہ آنسو دراصل کمزوری نہیں بلکہ محبت کا اظہار ہیں۔

؎ دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

ماں کی یاد ایسی چیز ہے جو دل کے نرم ترین گوشوں کو چھو جاتی ہے۔ اس یاد کے سامنے عقل، ضبط اور صبر سب بے بس ہو جاتے ہیں۔ مصنف کے دل میں ماں کی یاد ایک مسلسل تڑپ بن گئی ہے۔ وہ رونا نہیں چاہتے، مگر آنکھوں سے آنسو خود بخود بہہ نکلتے ہیں۔ یہ آنسو دکھ کے بھی ہیں، محبت کے بھی، شکر کے بھی۔ دکھ اس بات کا کہ ماں اب ساتھ نہیں، محبت اس لیے کہ وہ ہمیشہ دل میں زندہ ہیں اور شکر اس لیے کہ زندگی میں ماں جیسی ہستی نصیب ہوئی۔

مختصر یہ کہ اس عبارت میں صرف ایک بیٹے کی ماں سے محبت نہیں بلکہ ایک بڑے انسانی تجربے کا بیان ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں، ہر ثقافت میں، ہر مذہب میں ماں کو عظیم مقام حاصل ہے۔ اس کی محبت، اس کی قربانیاں، اور اس کا خلوص سب کے لیے مثال ہیں۔ مصنف کی ماں دراصل ہر اس ماں کی علامت ہے جو اپنی اولاد کے لیے اپنی خوشیاں قربان کرتی ہے، جو سادگی میں خوش رہتی ہے، جو دکھاوے سے دور اور محبت میں سچی ہوتی ہے۔

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے (علامہ اقبالؒ)

مشقی سوالات

۱ مختصر جواب دیں۔

(الف) بار کے علاقے سے کیا مراد ہے؟

جواب: پنجاب کے علاقے لائل پور، جھنگ اور سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ یہ ایسے علاقے تھے جو بنجر اور جنگلات پر مشتمل تھے۔ نہری نظام کی آمد پر یہاں نئی آبادیاں قائم کی گئی تھیں۔

(ب) ماں جی کے اسباب میں کیا کیا چیزیں شامل تھیں؟

جواب: اسبابِ دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

(ج) عبد اللہ صاحب اپنی دُلھن کو کہاں لے گئے؟

جواب: عبد اللہ صاحب اپنی بیوی کو گلگت لے گئے تھے۔ علی گڑھ سے نکلنے کے بعد وہ دور افتادہ علاقے گلگت میں چلے گئے تھے اور وہاں گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ اس لیے شادی کے بعد بھی وہیں رہے۔

(د) سرسید احمد خان کس بات پر عبد اللہ صاحب پر خفا ہوئے؟

جواب: سرسید احمد خان چاہتے تھے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ نوکریاں حاصل کریں۔ وہ عبد اللہ صاحب کی قابلیت سے واقف تھے اس لیے انھیں انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ عبد اللہ صاحب نے انکار کر دیا۔ سرسید بہت غصہ ہوئے اور انھیں خوب سخت سست کہا۔

(ہ) 'ماں جی' کو میلاد دیکھنے کے لیے کتنے پیسے ملے تھے؟

جواب: میلے میں ماں جی نے صرف گیارہ پیسے کی فرمائش کی تھی۔ عبد اللہ صاحب نے انھیں زیادہ پیسے دینے پر اصرار کیا تھا لیکن ماں جی نے انکار کر دیا۔

۲ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) نانا جی دو تین بار شہر تلاش میں گئے:

(i) نوکری کی (ii) کاروبار کی (iii) زمین کی (iv) معاوضے کی

(ب) نانا جی نے بقریر عید پر ماں جی کو عیدی دی:

(i) گیارہ پیسے (ii) بارہ پیسے (iii) دو آنے (iv) تین آنے

(ج) نانا جی اپنی بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ لے کر روانہ ہوئے:

(i) فیروز پور (ii) لائل پور (iii) انبالہ (iv) گلگت

(د) عبد اللہ صاحب کو ولایت جانے سے منع کیا:

(i) والدہ نے (ii) والد نے (iii) ماں جی نے (iv) نانا جی نے

(ہ) افسانہ "ماں جی" کے تخلیق کار کا نام ہے:

(i) اشفاق احمد (ii) قدرت اللہ شہاب (iii) ممتاز مفتی (iv) بانو قدسیہ

جوابات

الف	معاوضے کی	ب	تین آنے	ج	لائل پور	د	والدہ نے	ہ	قدرت اللہ شہاب

۳ سبق ماں جی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملوں کی وضاحت کریں۔

(الف) "اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی میرے بیٹے یا میری بیٹی کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔"

جواب: اس جملے میں ماں جی کی سادگی اور توکل کا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق تھیں کہ وہ اپنی اولاد کو بھی اپنی نہ کہتی تھیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا مال کہتی تھیں۔

(ب) ''بھاگوان! شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمھیں گیارہ پیسے دیے تھے کیا ان کی واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟''

جواب: یہ جملہ عبد اللہ صاحب نے اپنے آخری لمحات میں کہا تھا۔ ماں جی اتنی سادہ اور بے نیاز تھیں کہ کبھی عبد اللہ صاحب سے کوئی فرمائش ہی نہیں کی۔ آخری لمحات میں جب ماں جی عبد اللہ صاحب کے قریب بیٹھی تھیں تب ماں جی کو چھیڑنے کے لیے عبد اللہ صاحب نے ان سے گیارہ پیسوں کا مطالبہ کیا جو شادی سے پہلے انھوں نے دیے تھے۔

(ج) ''اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔''

جواب: ماں جی اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہتی تھیں۔ عبد اللہ صاحب کی وفات پر انھوں نے بچوں کو رونے نہیں دیا کہ اس سے عبد اللہ صاحب کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ ماں جی کی وفات کے بعد رونے سے ڈر لگتا ہے کہ اس سے ماں جی کی روح کو تکلیف پہنچے گی اور ضبط کرنا بھی ممکن نہیں۔

۴ کیا قدرت اللہ شہاب کی افسانوی تحریر ''ماں جی'' میں سماجی اور روحانی پہلو نمایاں ہیں؟ تبصرہ کریں۔

جواب: قدرت اللہ شہاب کی تحریر ''ماں جی'' ان کے فکر و فن کا شاہ کار ہے۔ اس میں سماج اور تصوف دونوں پہلو نمایاں ہیں۔ اس میں سماجی رویوں کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ سادہ لوح لوگوں کو ملنے والے دھکے اور دھوکے نمایاں کیے گئے ہیں۔ غربت کے ماروں کے گزرنے والے شب و روز کا بہت وضاحت سے اظہار کیا گیا ہے۔ سرکاری کھاتوں اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں کا حال بھی پوری وضاحت سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اس افسانے میں روحانی پہلو بھی بالکل واضح ہے۔ ماں جی کی طبیعت کی سادگی صوفیانہ ماحول کی دین ہے۔ وہ ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ وہ کبھی کوئی شکایت نہیں کرتیں۔ ان کی زبان پر کوئی سوال آتا ہی نہیں۔ وہ روحانی طور پر اتنی مضبوط ہیں کہ اپنے میاں کی وفات پر بچوں کو دلاسا دے رہی ہیں۔ اور اپنے بچوں کی وفات پر راضی بہ رضا کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ انھوں نے دنیا سے بے نیاز ہو کر پُرسکون اور بے فکر زندگی گزار دی۔

۵ سبق کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے سبق کا خلاصہ

۶ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں۔

(الف) ''کھانے پینے میں وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چپاتی اُن کی محبوب خوراک تھی۔''

جواب: دیکھیے حصہ تشریحات

تذکیر و تانیث

جنس کے لحاظ سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔

(i) مذکّر (ii) مؤنّث

(i) **مذکّر:** وہ اسم جو ''نر'' کے لیے استعمال کیا جائے، جیسے سُسر، لڑکا، بیٹا وغیرہ۔

(ii) **مؤنّث:** وہ اسم جو ''مادہ'' کے لیے استعمال ہو، جیسے ساس، لڑکی، بیٹی وغیرہ۔

تذکیر و تانیث دو طرح کی ہوتی ہے۔

(i) حقیقی تذکیر و تانیث (ii) غیر حقیقی تذکیر و تانیث

(i) **حقیقی تذکیر و تانیث:** انسانوں اور جان داروں کی تذکیر و تانیث کو حقیقی تذکیر و تانیث کہا جاتا ہے۔

(ii) **غیر حقیقی تذکیر و تانیث:** اس میں ہم اسموں میں نر اور مادہ کی تمیز نہیں کر سکتے بلکہ اہلِ زبان کے محاورے سے ان کی پہچان ہوتی ہے مثلاً: لباس اور رومال مذکر ہیں جب کہ حویلی اور کرسی مؤنّث ہیں۔

7 درج ذیل الفاظ کے جملے بنا کر تذکیر و تانیث واضح کریں۔

سورج مٹی شہر ریاست اخبار اردو چاند

جواب:

الفاظ	جملے
سورج	سورج مشرق سے نکلتا ہے۔
مٹی	وطن کی مٹی کا قرض ہر شہری پر ہوتا ہے۔
شہر	ہم نے پاکستان کا ہر مشہور شہر دیکھا ہے۔
ریاست	ہماری ریاست کی بنیاد اسلام پر ہے۔
اخبار	کیا آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟
اردو	ہمیں اردو فخر سے بولنی چاہیے۔
چاند	چاند رات کو چمکتا ہے۔

8 سبق ''ماں جی'' کا بغور مطالعہ کیجیے اور اس میں سے غیر حقیقی تذکیر و تانیث تلاش کیجیے۔

جواب: **غیر حقیقی تذکیر و تانیث:**

مذکر: سال، گاؤں، دریا، شہر، کنبہ، تہوار، چراغ، مکان، رعب، امتحان، غصہ، میلا، مال، وقت

مؤنث: زمین، کالونی، نہر، عمر، خواہش، بنیاد، فرمائش، جمعرات، نیند، قیامت، خیرات، روح

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ ماں جی کا آبائی گاؤں تھا:

(الف) مبارک پور (ب) میلہ (ج) شاہ کوٹ (د) ریہڑ (ب)

2۔ ماں جی کے آبائی گاؤں کا ضلع تھا:

(الف) گورداس پور (ب) ہوشیار پور (ج) انبالہ (د) جالندھر (ج)

3۔ لائل پور، جھنگ اور سرگودھا کا علاقہ عرفِ عام میں کہلاتا تھا:

(الف) دامنِ کوہ (ب) بار (ج) تلہار (د) تھل (ب)

4۔ ستلج کے کنارے کھدائی ہو رہی تھی:

(الف) نہر سرہند کی (ب) نہر اپر چناب کی (ج) نہر لوئر باری کی (د) نہر جہلم کی (الف)

5۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہوئی:

(الف) روپڑ میں (ب) لائل پور میں (ج) جڑانوالہ میں (د) گلگت میں (الف)

6۔ نانا جی کا مزاج تھا:

(الف) چست (ب) سیدھا (ج) لڑاکا (د) چالاک (ب)

7۔ نانا جی نے معاوضہ نہ ملنے پر:

(الف) مقدمہ کیا (ب) شور مچایا (ج) صبر و شکر کیا (د) نوکری تلاش کی (ج)

8۔ نانا جی کے ساتھ لائل پور جانے والے کنبے میں بچے تھے:

(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (ب)

9۔ نانا جی لائل پور گئے:

(الف) پاپیادہ (ب) ٹرین پر (ج) بیل گاڑی پر (د) گھوڑے پر (الف)

10۔ لائل پور کے سفر میں نانا جی کام کرتے تھے:
(الف) مزدوری اور قلی کا (ب) دکان داری (ج) کاشتکاری (د) ملازمت (الف)

11۔ نانی اور ماں جی راستے میں کرتی تھیں:
(الف) سلائی کڑھائی (ب) سوت کاتنا اور لیپائی (ج) مکھن نکالنا (د) کھانا پکانا (ب)

12۔ جڑانوالہ پہنچنے تک وقت لگا:
(الف) ہفتوں کا (ب) مہینوں کا (ج) ڈیڑھ دو مہینے کا (د) ایک سال کا (ج)

13۔ جڑانوالہ میں نانا جی نے کام کیا:
(الف) ہوٹل پر (ب) غلہ منڈی میں (ج) سبزی منڈی میں (د) چوکیداری (ب)

14۔ ماں جی کا جڑانوالہ میں قیام تھا:
(الف) چھوٹے سے جھونپڑے میں (ب) حویلی میں (ج) سرکاری کوارٹر میں (د) کرائے کے مکان میں (الف)

15۔ بقرعید پر ماں جی کو عیدی ملی:
(الف) ایک روپیہ (ب) دو آنے (ج) تین آنے (د) چار آنے (ج)

16۔ عیدی کے تین آنے ماں جی نے رکھے:
(الف) ڈبیا میں (ب) دوپٹے کے کونے میں (ج) بٹوہ میں (د) صندوق میں (ب)

17۔ ماں جی نے مسجد میں تیل کے لیے رقم دی:
(الف) آٹھ پیسے (ب) نو پیسے (ج) دس پیسے (د) گیارہ پیسے (د)

18۔ ماں جی کی عینک، تسبیح اور انگوٹھی تھی، ان کا:
(الف) کل اسباب (ب) ذاتی زیورات (ج) وراثتی اشیا (د) تحفے (الف)

19۔ ماں جی کی انگوٹھی میں فیروزے تھے:
(الف) ایک (ب) دو (ج) تین (د) چار (ب)

20۔ ماں جی کی مرغوب غذا تھی:
(الف) پلاؤ (ب) پراٹھے (ج) مکئی کی روٹی اور چٹنی (د) گوشت (ج)

21۔ ماں جی ناشتے میں چائے کے پیالے پیتی تھیں:
(الف) ایک (ب) دو (ج) تین (د) چار (ب)

22۔ گرمیوں میں ماں جی کی محبوب خوراک تھی:
(الف) آم اور دودھ (ب) دہی بڑے (ج) نمکین لسی اور روٹی (د) کچی لسی (ج)

23۔ ماں جی اپنے بچوں کو کہتی تھیں:
(الف) میرا سرمایہ (ب) اللہ کا مال (ج) میری جان (د) میری دولت (ب)

24۔ برادری میں رعب کے لیے نانی ماں جی کو پہناتی تھیں:
(الف) ساڑھی (ب) نت نئے کپڑے (ج) زیورات (د) مہنگے جوتے (ب)

25۔ ماں جی کا گاؤں میں نکلنا دوبھر کیا تھا:
(الف) لوگوں کے تجسس نے (ب) غربت نے (ج) بیماری نے (د) حالات نے (الف)

26۔ ماں جی کی خواہش تھی کہ:
(الف) امیر شوہر کی (ب) پڑھے لکھے شوہر کی (ج) خوب صورت شوہر کی (د) بڑے گھر کی (ب)

27۔ عبداللہ صاحب یتیم ہوئے تھے:
(الف) نو سال کی عمر میں (ب) بارہ برس کی عمر میں (ج) پانچ چھ برس کی عمر میں (د) بیس برس کی عمر میں (ج)

28۔ عبداللہ صاحب میٹرک میں اول آئے تھے:
(الف) پنجاب یونی ورسٹی سے (ب) دلی یونی ورسٹی سے (ج) علی گڑھ سے (د) بمبئی یونی ورسٹی سے (الف)

29۔ سرسید کے منشی نے عبداللہ صاحب کو بلایا تھا:
(الف) لاہور (ب) علی گڑھ (ج) دہلی (د) آگرہ (ب)

30۔ عبداللہ صاحب علی گڑھ میں لیکچرر ہوئے:
(الف) ایم اے کے بعد (ب) بی اے کے بعد (ج) پی ایچ ڈی کے بعد (د) ایف اے کے بعد (الف)

31۔ عبداللہ صاحب لیکچرر ہوئے:
(الف) 18 برس کی عمر میں (ب) 19 برس کی عمر میں (ج) 20 برس کی عمر میں (د) 21 برس کی عمر میں (ب)

32۔ عبداللہ صاحب علی گڑھ سے نکل کر گئے:
(الف) کشمیر (ب) کوئٹہ (ج) گلگت (د) پشاور (ج)

33۔ گلگت میں عبداللہ صاحب فائز ہوئے:
(الف) تحصیلداری پر (ب) گورنری پر (ج) کلرکی پر (د) صدارت پر (ب)

34۔ ماں جی کی سہیلیوں نے عبداللہ صاحب سے میلے میں مانگے:
(الف) پانچ روپے (ب) دس روپے (ج) گیارہ پیسے (د) ایک روپیہ (الف)

35۔ عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین محدود تھا:
(الف) روپوں تک (ب) گیارہ پیسوں تک (ج) زیورات تک (د) کپڑوں تک (ب)

36۔ ماں جی کی خوش نصیبی کے پردے میں تھے:
(الف) دکھ اور صدمے (ب) عیش و آرام (ج) دولت (د) شہرت (الف)

37۔ ماں جی کے کل بچے تھے:
(الف) چار (ب) پانچ (ج) چھ (د) سات (ج)

38۔ وفات کے وقت ماں جی کی عمر تھی:
(الف) ستر برس (ب) اسّی برس (ج) نوے برس (د) سو برس (ب)

39۔ عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا:
(الف) سہ پہر کے وقت (ب) صبح کے وقت (ج) رات کے وقت (د) شام کے وقت (د)

40۔ عبداللہ صاحب انتقال کے وقت چوس رہے تھے:
(الف) سیب (ب) گنا (ج) امرود (د) کیلا (ب)

41۔ ماں جی نے عبداللہ صاحب کے انتقال پر بچوں کو تلقین کی:
(الف) رونے کی (ب) صبر کرنے کی (ج) نہ رونے کی (د) چیخنے کی (ج)

42۔ قدرت اللہ شہاب کے مطابق ماں جی تھیں:
(الف) معمولی عورت (ب) ایک عظیم ہستی (ج) سادہ خاتون (د) دنیادار عورت (ب)

43۔ ماں جی فاتحہ دلاتی تھیں:
(الف) زردے سے (ب) پلاؤ سے (ج) مکئی کی روٹی اور چٹنی سے (د) مٹھائی سے (ج)

44۔ ماں جی کے نام پر خیرات کے لیے رقم سو جمتی تھی:
(الف) دس روپے (ب) گیارہ پیسے (ج) بیس روپے (د) پانچ روپے (ب)

45۔ ماں جی کے نزدیک سو روپے اور دس روپے میں فرق کرنا تھا:
(الف) مشکل (ب) آسان (ج) ناممکن (د) معمولی (الف)

46۔ ماں جی کا لباس تھا:
(الف) ریشمی (ب) سوتی (ج) مخملی (د) اونی (ب)

47۔ نانی جی کا کام تھا:
(الف) کھانا پکانا (ب) سلائی کرنا (ج) چرخہ کاتنا (د) کھیتی باڑی (ج)

48۔ ماں جی مسجد میں تیل ڈالتی تھیں:
(الف) ہر روز (ب) ہر جمعرات (ج) ماہانہ (د) سالانہ (ب)

49۔ ماں جی کھانا کھاتی تھیں:
(الف) دو وقت (ب) ایک وقت (ج) تین وقت (د) چار وقت (الف)

50۔ ماں جی خوش ہوتی تھیں:
(الف) خود کھا کر (ب) دوسروں کو کھاتے دیکھ کر (ج) تحفے لے کر (د) باتیں کر کے (ب)

51۔ ماں جی بچوں کو سمجھتی تھیں:
(الف) اپنی ملکیت (ب) اپنا سہارا (ج) اللہ کا مال (د) اپنا مستقبل (ج)

52۔ عبداللہ صاحب نے ریکارڈ قائم کیا:
(الف) پانچویں میں (ب) میٹرک میں (ج) بی۔اے میں (د) ایم۔اے میں (الف)

53۔ علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی:
(الف) علامہ اقبال نے (ب) سرسید نے (ج) لیاقت علی خان نے (د) قائداعظم نے (ب)

54۔ سرسید نے عبداللہ صاحب کو وظیفہ دیا تھا:
(الف) کاروبار کے لیے (ب) تعلیم کے لیے (ج) حج کے لیے (د) گھر کے لیے (ب)

55۔ سرسید نے عبداللہ صاحب کی پٹائی کی:
(الف) غصے میں (ب) پیار میں (ج) مذاق میں (د) سختی میں (الف)

56۔ عبداللہ صاحب کے لیے گلگت تھا:
(الف) جنت (ب) کاروبار کی جگہ (ج) دور افتادہ مقام (د) تفریح گاہ (ج)

57۔ ماں جی نے میلے میں مانگا:
(الف) ایک روپیہ (ب) گیارہ پیسے (ج) انگوٹھی (د) کچھ نہیں (ب)

58۔ ماں جی کا عبداللہ صاحب سے لین دین تھا:
(الف) گیارہ پیسوں کا (ب) ہزاروں کا (ج) لاکھوں کا (د) نہیں تھا (الف)

59۔ عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا:
(الف) 50 سال کی عمر میں (ب) 62 سال کی عمر میں (ج) 70 سال کی عمر میں (د) 80 سال کی عمر میں (ب)

60۔ عبداللہ صاحب کے انتقال کے وقت ماں جی کی عمر تھی:
(الف) 45 سال (ب) 60 سال (ج) 55 سال (د) 65 سال (ج)

61۔ عبداللہ صاحب سو رہے تھے:
(الف) صوفے پر (ب) بان کی چارپائی پر (ج) پلنگ پر (د) فرش پر (ب)

62۔ ماں جی کی روح کو تکلیف پہنچتی تھی:
(الف) رونے سے (ب) ہنسنے سے (ج) بولنے سے (د) کھانے سے (الف)

63۔ لائل پور میں نئے آباد کاروں کو زمین ملتی تھی:
(الف) کرائے پر (ب) مفت (ج) نیلامی پر (د) تحفے میں (ب)

64۔ نانا جی کا کنبہ لائل پور گیا:
(الف) سواری پر (ب) ٹرین پر (ج) پاپیادہ (د) کشتی پر (ج)

65۔ راستے میں نانا جی نے جگہ جگہ کام کیا:
(الف) کلرکی کا (ب) قلی کا (ج) ڈرائیوری کا (د) تجارت کا (ب)

66۔ ماں جی نے تیل خریدا تھا:
(الف) مسجد کے چراغ کے لیے (ب) بالوں کے لیے (ج) کھانا پکانے کے لیے (د) سوپ کے لیے (الف)

67۔ ماں جی کی غذا تھی:
(الف) مرغن (ب) سادہ (ج) تیز مصالحے والی (د) پُرتکلف (ب)

68۔ ماں جی کا عقیدہ تھا:
(الف) ہر نوالے پر اللہ کے شکر کا (ب) ناشکری کا (ج) شکایت کا (د) غصے کا (الف)

69۔ ماں جی کی مرغوب خوراک تھی:
(الف) پھل (ب) مکئی کی روٹی اور چٹنی (ج) پلاؤ (د) کباب (ب)

70۔ سرسید نے عبداللہ صاحب کو وظیفہ دیا:
(الف) ولایت جانے کا کے لیے (ب) شادی کرنے کا کے لیے
(ج) گھر بنانے کا کے لیے (د) کاروبار کا کے لیے (الف)

71۔ عبداللہ صاحب نے وظیفہ واپس کیا:
(الف) والدہ کی خاطر (ب) سرسید کی خاطر (ج) اپنی خاطر (د) ملک کی خاطر (الف)

72۔ عبداللہ صاحب یتیم ہوئے:
(الف) 3-2 برس کی عمر میں (ب) 6-5 برس کی عمر میں
(ج) 9-8 برس کی عمر میں (د) 12-10 برس کی عمر میں (ب)

73۔ عبداللہ صاحب نے بی اے کرنے کے بعد نوکری شروع کی:
(الف) علی گڑھ (ب) لاہور (ج) دہلی (د) بمبئی (الف)

74۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے منع کیا تھا:
(الف) شادی سے (ب) نوکری سے (ج) ولایت جانے سے (د) شہر جانے سے (ج)

75۔ علی گڑھ سے نکلنے کے بعد عبداللہ صاحب پہنچے:
(الف) کشمیر (ب) گلگت (ج) پشاور (د) کوئٹہ (ب)

76۔ گلگت میں عبداللہ صاحب کا عہدہ تھا:
(الف) گورنر (ب) کلرک (ج) تحصیلدار (د) مجسٹریٹ (الف)

77۔ سرسید نے عبداللہ صاحب کو تعلیم کے لیے بھیجنا چاہا:
(الف) انگلستان (ب) امریکہ (ج) جرمنی (د) فرانس (الف)

78۔ ماں جی کی کتنی بیٹیاں فوت ہوئیں:
(الف) ایک (ب) تین (ج) دو (د) چار (ج)

79۔ سبق ''ماں جی'' کے مصنف ہیں:
(الف) پطرس بخاری (ب) قدرت اللہ شہاب (ج) مشتاق یوسفی (د) کوئی نہیں (ب)